مشرق
کہانی میگزین
05 تا 11 اپریل 2026ء

کیا دنیا تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے؟

ایران، امریکہ اور اسرائیل کی جنگ کے 35 ویں دن

مہنگائی کا طوفان، تیل کا بحران، عرب ممالک کی معاشی زبوں حالی اور پاکستان پر لگاتار معاشی دھچکے

ایران کی حیران کن جنگی حکمت عملی: امریکہ اور اسرائیل کو دھچکا

ٹرمپ کا اعتماد جیت کر پاکستان کیسے ایران جنگ میں ایک غیر متوقع ثالث بنا؟

ایران کی آبنائے باب المندب تجارتی راستے کی ممکنہ بندش کی دھمکیاں

صحرا کی آغوش میں ایک خواب کی سلطنت

ری پبلک آف سلوجامستان

معظم خان

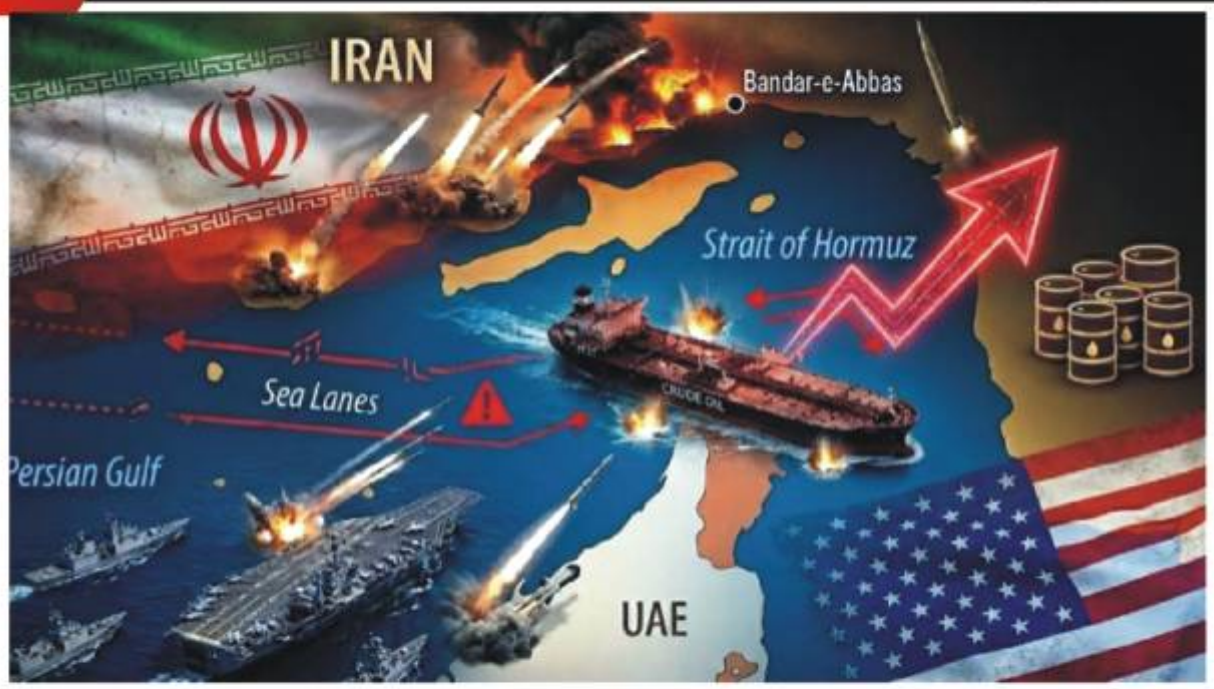

ایران، امریکہ اور اسرائیل کی جنگ کے 35 ویں دن

مہنگائی کا طوفان، تیل کا بحران، عرب ممالک کی معاشی زبوں حالی اور پاکستان پر لگاتار معاشی دھچکے

عالمی بینک اور دیگر عالمی اداروں نے خبردار کیا ہے کہ اگر یہ جنگ مزید بڑھی تو عالمی معیشت میں گہری کساد بازاری آسکتی ہے، توانائی کی قیمتیں مزید بڑھ سکتی ہیں اور غربت کی لہر ترقی پذیر ممالک کو شدید متاثر کرسکتی ہے۔

جس وقت پوری دنیا کی نظریں مشرق وسطیٰ کی اس آگ پر جمی ہوئی ہیں جو 35 دن پہلے بھڑکی تھی اور اب تہران کے آس پاس تک پھیل چکی ہے، اسی وقت عالمی معیشت ایک ایسے طوفان کا شکار ہے جس کی شدت نے نہ صرف تیل کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرائی ہیں بلکہ ہر ملک کی معاشی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایران کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ فوجی کارروائی نے آبنائے ہرمز کو بند کر کے عالمی تیل کی سپلائی لائن کو تقریباً مفلوج کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں پٹرول، گیس اور دیگر توانائی مصنوعات کی قیمتیں ریکارڈ سطح پر پہنچ چکی ہیں۔ اس جنگ نے صرف فوجی نقصانات ہی نہیں دیے بلکہ انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ اربوں ڈالر کی معاشی تباہی بھی برپا کر دی ہے۔ ایرانی وزارت خارجہ کے مطابق جنگ کے آغاز سے اب تک 2076 افراد جاں بحق اور 26 ہزار 500 سے زائد زخمی ہو چکے ہیں جبکہ 600 سے زیادہ اسکول اور تعلیمی مراکز تباہ ہو چکے ہیں۔ حالیہ حملوں میں ایک صدی پرانا طبی تحقیقاتی ادارہ، اسٹیل پلانٹس اور تہران کے قریب ایک اہم پل نشانہ بنا ہے۔ امریکہ اس پل کو فوجی استعمال کا ذریعہ قرار دے رہا ہے جبکہ ایران اسے شہری انفرا اسٹرکچر قرار دیتے ہوئے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کا الزام لگا رہا ہے۔ یہ جنگ اب صرف علاقائی نہیں رہی بلکہ عالمی معیشت، توانائی کی فراہمی اور انسانی بحران کو ایک ایسے گہرے گڑھے میں دھکیل چکی ہے جس سے نکلنے کا راستہ صرف سفارتی مذاکرات ہی ہوسکتا ہے۔

اس جنگ کے سب سے براہ راست اور تباہ کن اثر عالمی مہنگائی کے طوفان کی صورت میں سامنے آ رہے ہیں۔ آبنائے ہرمز کی بندش نے عالمی تیل کی تقریباً 20 فیصد سپلائی روک دی ہے جس کی وجہ سے پٹرول کی قیمتیں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے ہر کونے میں دوگنی سے زیادہ ہو چکی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو انفلیشن کی شرح 8 سے 12 فیصد تک جا پہنچی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں یہ 15 سے 25 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ عرب ممالک، جو روایتی طور پر تیل کے بڑے برآمد کنندہ ہیں، اس بحران میں سب سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ علاقائی عدم استحکام نے نہ صرف ان کی برآمدات متاثر کی ہیں بلکہ مقامی مارکیٹوں میں بھی توانائی کی قلت نے معاشی سرگرمیاں تقریباً روک دی ہیں۔ متحدہ عرب امارات میں گرنے والے ملبے سے ایک غیر ملکی مزدور ہلاک ہو چکا ہے، بحرین میں سائرن بجائے جا رہے ہیں اور شہریوں کو محفوظ مقامات کی طرف جانے کی ہدایات دی جا رہی ہیں۔ سعودی عرب نے ایک ڈرون مار گرانے کا دعویٰ کیا ہے جبکہ کویت کے ایئرپورٹ پر لگی آگ نے پورے علاقے کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ خلیجی ممالک کی معیشتیں، جو تیل کی آمدنی پر منحصر ہیں، اب نہ صرف پیداوار میں کمی کا شکار ہیں بلکہ جنگی خطرات نے سرمایہ کاری کو بھی روک دیا ہے۔ عالمی بینک اور دیگر عالمی اداروں نے خبردار کیا ہے کہ اگر یہ جنگ مزید بڑھی تو عالمی معیشت میں گہری کساد بازاری آسکتی ہے، توانائی کی قیمتیں مزید بڑھ سکتی ہیں اور غربت کی لہر ترقی پذیر ممالک کو شدید متاثر کرسکتی ہے۔

حکومت نے 3 اپریل 2026 سے پٹرول کی فی لیٹر قیمت 458 روپے 40 پیسے اور ڈیزل کی 520 روپے 35 پیسے کردی ہے جو کہ پچھلے ہفتوں کے مقابلے میں پٹرول میں 137 روپے اور ڈیزل میں 184 روپے کا تاریخی اضافہ ہے

پاکستان اس عالمی بحران کا سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک بن چکا ہے جہاں حکومت نے تیل کی قیمتیں بڑھا کر عوام پر مہنگائی اور افراتفری کا نیا طوفان برپا کر دیا ہے۔ شدید معاشی بحران کے شکار پاکستان میں پہلے ہی بجلی، گیس اور پٹرول کی قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں اور اب عالمی تیل کے بحران نے صورتحال کو انتہائی نازک بنا دیا ہے۔ حکومت کی جانب سے تیل کی قیمتیں بڑھانے کا فیصلہ عوام کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا ہے۔ لاکھوں خاندان روزمرہ ضروریات کی قیمتوں میں اضافے سے دوچار ہیں، کاروبار بند ہو رہے ہیں، فیکٹریاں بندش کا شکار ہیں اور غریب طبقہ دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے حاصل کر پا رہا ہے۔ عوام حکومت سے شدید نالاں ہے اور مختلف شہروں میں احتجاج کی لہر اٹھ رہی ہے۔ سڑکوں پر مظاہرے، ٹائر جلانے اور دھرنے اس بات کی عکاسی کر رہے ہیں کہ عوام اس معاشی دباؤ کو مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان کے ہمسایہ ملک بھارت میں بھی پٹرول اور گیس کا شدید ترین بحران پایا جا رہا ہے جہاں قیمتیں ریکارڈ سطح پر پہنچ چکی ہیں اور عوام سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ دونوں ممالک کی معیشتیں، جو پہلے ہی مختلف چیلنجز کا شکار تھیں، اب اس جنگ کے سائے میں مزید دباؤ میں آگئی ہیں۔

امریکہ اس جنگ میں پھنس کر اربوں ڈالر کا بجٹ ضائع کر چکا ہے۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی انتظامیہ نے فوجی آپریشنز پر جو اخراجات کیے ہیں ان کا تخمینہ اربوں ڈالر میں ہے اور اب واشنگٹن میں اندرونی تبدیلیاں اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ حکمت عملی میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ امریکی وزیر دفاع پیٹ ہیگسیتھ نے آرمی چیف آف اسٹاف جنرل رینڈی جارج سمیت کئی اعلیٰ فوجی افسران کو عہدوں سے ہٹا دیا ہے۔ یہ تبدیلیاں جنگی حکمت عملی میں نئے رخ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اسی طرح اٹارنی جنرل پام بونڈی کو برطرف کر کے نائب اٹارنی جنرل ٹاڈ بلانچے کو قائم مقام مقرر کیا گیا ہے۔ صدر ٹرمپ نے ایران کے خلاف مزید سخت اقدامات کی دھمکی دی ہے اور کہا ہے کہ اگر ایران نے امریکی شرائط قبول نہ کیں تو مزید انفرا اسٹرکچر نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ٹرمپ کا بیان کہ وہ جب چاہیں آسانی سے آبنائے ہرمز کھول سکتے ہیں اور بڑی کمائی کر سکتے ہیں، ان کی پالیسی میں تضاد کو ظاہر کر رہا ہے۔ پہلے وہ کہتے رہے تھے کہ ہرمز کھلا رکھنے کی ذمہ داری یورپ اور ایشیائی ممالک پر ہے، اب اکیلے ہی یہ کام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ یہ بیانات فیس سیونگ کے لیے لگ رہے ہیں اور امریکی عوام میں بھی جنگ کی حمایت کم ہو رہی ہے۔

اس جنگ نے ایران کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے مگر ایرانی صدر مسعود پزشکیان نے امریکی عوام کے نام کھلا خط لکھ کر واضح کیا ہے کہ ایران امریکی عوام سے کوئی دشمنی نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا کہ ایران کو خطرہ قرار دینا حقائق کے منافی ہے اور 1953 کی فوجی بغاوت سے لے کر آج تک کی غیر ملکی مداخلتوں نے عدم اعتماد پیدا کیا ہے۔ ایرانی فورسز نے امریکی ایف-35 لڑاکا طیارہ مار گرایا ہے جس کے پائلٹ کی تلاش جاری ہے۔ ایرانی خبر رساں ادارے تسنیم نے ملبے کی تصاویر جاری کی ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ پائلٹ کو تحویل میں لے لیا گیا ہے۔ امریکی عہدیداروں نے بھی اس واقعے کی تصدیق کرتے ہوئے سرچ اینڈ ریسکیو آپریشن جاری رکھا ہے۔ اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے دعویٰ کیا ہے کہ اسرائیلی حملوں سے ایران کی سٹیل پیداوار کی 70 فیصد صلاحیت ختم ہوگئی ہے اور پاسداران انقلاب مالی و عسکری وسائل سے محروم ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ٹرمپ اور اسرائیلی فوج کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا ذکر کیا اور حزب اللہ کے خلاف کارروائی جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان اور اسلامی ممالک مل کر اس جنگ کو مزید بڑھنے سے روک سکتے ہیں اور کیا پاکستان اپنا کردار ادا کرسکتا ہے؟ پاکستان نے ہمیشہ سے علاقائی امن کا علمبردار رہا ہے اور اس وقت بھی سفارتی محاذ پر فعال ہے۔ نائب وزیراعظم و وزیر خارجہ اسحاق ڈار نے سعودی عرب کے ہم منصب سے رابطہ کیا اور خطے کی تازہ صورتحال پر تبادلہ خیال کیا۔ دونوں رہنماؤں نے پاکستان اور سعودی عرب کے مضبوط برادرانہ تعلقات کا اعادہ کیا اور علاقائی کشیدگی میں کمی کے لیے مذاکرات کی فوری ضرورت پر زور دیا۔ اس موقع پر خلیج اور مشرق وسطیٰ میں امن کے لیے پاکستان-چین پانچ نکاتی ایجنڈے پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ پانچ نکاتی ایجنڈا علاقائی استحکام، تیل کی سپلائی کی بحالی، انسانی بحران کے حل، سفارتی راستوں کو کھولنے اور تمام فریقین کے درمیان بات چیت کی بحالی پر مبنی ہے۔ پاکستان، جو سعودی عرب، چین، ایران اور امریکہ کے ساتھ متوازن تعلقات رکھتا ہے، ایک اہم ثالث کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ اسلامی ممالک اگر او آئی سی کے پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں تو وہ جنگ کو روکنے اور مذاکرات کی میز پر لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت، اس کی فوجی قوت اور سفارتی تجربہ اسے اس جنگ کے خاتمے میں کلیدی کردار ادا کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اگر پاکستان چین کے ساتھ مل کر یہ پانچ نکاتی ایجنڈا عملی شکل دے دے تو یہ نہ صرف خطے بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک بڑی کامیابی ثابت ہوسکتا ہے۔

برطانیہ تقریباً 40 ممالک کے ساتھ مل کر آبنائے ہرمز کو دوبارہ کھولنے کی بات چیت کر رہا ہے مگر ابھی تک کوئی ٹھوس پیش رفت نہیں ہوسکی۔ ایرانی صدر کا خط اور ٹرمپ کے بیانات بتاتے ہیں کہ دونوں فریق ابھی بھی بات چیت کے راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں مگر فوجی کارروائیاں جاری ہیں۔ شمالی محاذ پر حزب اللہ اور اسرائیل کے درمیان جھڑپیں، عراق میں امریکی اڈوں پر حملے اور شام میں اسرائیلی کارروائیاں جنگ کے دائرے کو مزید وسیع کر رہی ہیں۔ عالمی ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر فوری سفارتی اقدامات نہ کیے گئے تو یہ جنگ نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ پوری دنیا کو اقتصادی اور انسانی بحران میں دھکیل دے گی۔ (باقی صفحہ 15 پر)

کیا دنیا تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے؟

اس جنگ کے اثرات صرف ایران تک محدود نہیں ہیں بلکہ خلیج میں واقع کم از کم ایک درجن دیگر ممالک بھی کسی نہ کسی طرح اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان ممالک میں متحدہ عرب امارات، عراق، بحرین، کویت، سعودی عرب، عمان، آذربائیجان، مقبوضہ مغربی کنارہ، قبرص، شام، قطر اور لبنان شامل ہیں

.....میگزین رپورٹ.....

امریکہ اور اسرائیل کی ایران کے خلاف جنگ کو ایک ماہ سے زائد وقت گزر چکا ہے اور اب یہ خدشات تیزی سے سر اٹھا رہے ہیں کہ کیا مشرق وسطیٰ میں جاری یہ تنازع مزید پھیل کر کسی بڑے عالمی تصادم میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس جنگ کے اثرات صرف ایران تک محدود نہیں ہیں بلکہ خلیج میں واقع کم از کم ایک درجن دیگر ممالک بھی کسی نہ کسی طرح اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان ممالک میں متحدہ عرب امارات، عراق، بحرین، کویت، سعودی عرب، عمان، آذربائیجان، مقبوضہ مغربی کنارہ، قبرص، شام، قطر اور لبنان شامل ہیں۔

اسی پس منظر میں بہت سے لوگ ان امکانات پر بات کر رہے ہیں کہ کیا موجودہ تنازع علاقائی سطح سے نکل کر ایک عالمی جنگ کی شکل اختیار کر سکتا ہے؟

ایک جنگ عالمی جنگ کب بنتی ہے؟

برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں بین الاقوامی تاریخ کی پروفیسر مارگریٹ میکملن کہتی ہیں کہ 'لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ جنگیں بہت سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے تحت لڑی جاتی ہیں اور یہ بھی کہ جنگ شروع کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔' پروفیسر مارگریٹ نے کہا کہ 'اگر آپ ماضی کی جنگوں پر نظر ڈالیں، خاص طور پر پہلی عالمی جنگ، تو اس کے آغاز کی بڑی وجہ حادثات تھے یا مخالفین کے بارے میں غلط اندازے۔' پروفیسر مارگریٹ کے مطابق: 'کبھی کبھی اس کو سکول کے میدان میں ہونے والی لڑائی کی طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے۔' انھوں نے کہا کہ سنہ 1914 میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز آسٹریا، ہنگری کے بادشاہ فرانز جوزف کے بھتیجے، آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ کے قتل سے ہوا۔ اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات ہوئے جو بالآخر ایک عالمی جنگ میں بدل گئے۔

چند ہی ہفتوں کے اندر پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آ چکا تھا: آسٹریا ہنگری نے سربیا کے خلاف کارروائی کی، جرمنی نے آسٹریا کی حمایت کی، روس نے سربیا کے حق میں فوجیں متحرک کیں، فرانس روس کے ساتھ کھڑا ہوا، اور برطانیہ نے وقار اور حکمتِ عملی کے نام پر جنگ میں قدم رکھ دیا۔ پروفیسر مارگریٹ کے مطابق، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ عالمی سانحہ بن گیا۔

کنگز کالج لندن میں بین الاقوامی تاریخ کے پروفیسر جو مایولو کے مطابق، عالمی جنگ سے مراد ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جس میں تمام بڑی عالمی طاقتیں شامل ہوں۔ انھوں نے بتایا: 'پہلی عالمی جنگ میں یورپی سامراجی طاقتیں ہی عالمی طاقت تھیں، جبکہ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ، جاپان اور چین بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔' بہت سے لوگ آج مشرق وسطیٰ میں جاری کشیدگی کو بنیادی طور پر ایک علاقائی تنازع قرار دیتے ہیں، تاہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ تنازع عالمی سطح پر پھیلنے کے لیے حالات موجود ہیں یا نہیں؟

ان کے ایک انٹرویو میں یوکرین کے صدر ولادیمیر زیلنسکی نے کہا تھا کہ ان کے خیال میں روسی صدر ولادیمیر پوتن تیسری عالمی جنگ کا آغاز پہلے ہی کر چکے ہیں، اور انھیں روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ماسکو پر سخت فوجی اور معاشی دباؤ ڈالا جائے۔ صدر زیلنسکی نے کہا تھا: 'میرا ماننا ہے کہ پوتن یہ جنگ پہلے ہی شروع کر چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کتنے علاقے پر قبضہ کر پائیں گے اور انھیں کیسے روکا جائے۔' تو اس بات کا کتنا خطرہ ہے کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی؟

پروفیسر مارگریٹ کہتی ہیں: 'میری رائے میں وہ ملک جو کشیدگی بڑھا سکتا ہے، وہ غالباً ایران ہو گا یا ایران کے اتحادی، جیسا کہ یمن میں حوثی۔' ان کے مطابق ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ ایک خطے میں جاری تنازع دوسرے علاقوں میں مواقع پیدا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چین یہ سوچ سکتا ہے کہ مغرب کی توجہ بٹی ہوئی ہے تو وہ تائیوان پر کوئی قدم بڑھا لے یا روس یہ سمجھ سکتا ہے کہ عالمی توجہ کہیں اور ہونے کے باعث وہ یوکرین میں اپنی کارروائیاں تیز کر سکتا ہے۔

مارگریٹ کہتی ہیں: 'یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے کہ ایک خطے سے جنگ پھیل کر دوسرے علاقوں تک پہنچ جائے۔ اس کی جزوی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خطے سے باہر کے ممالک تنازع کو اپنے لیے موقع کے طور پر دیکھتے ہیں، کیونکہ یہ ان طاقتوں کو مصروف رکھتا ہے جو عام حالات میں انہیں روک سکتی تھیں۔'

پروفیسر مایولو کا خیال ہے کہ یہ تنازع علاقائی سطح تک ہی محدود رہے گا اور اس میں خلیجی تعاون کونسل کے ممالک، جیسے کہ سعودی عرب، کسی نہ کسی شکل میں شامل ہو سکتے ہیں۔ تاہم وہ چین اور روس کو اس جنگ میں شامل ہوتا نہیں دیکھ رہے۔ وہ کہتے ہیں: 'دنیا میں کہیں کچھ ہو اور چین فوراً تائیوان پر حملہ کر دے گا، یہ قطعی بے بنیاد تصور ہے۔' ان کا کہنا تھا کہ 'اگر ہم واقعی عالمی جنگ، یعنی تیسری عالمی جنگ کی بات کر رہے ہیں، تو مجھے بالکل نہیں لگتا کہ چین یا روس اس میں براہ راست شامل ہونے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یورپ کا امکان تو اس سے بھی کم ہے۔'

پروفیسر مایولو کا خیال ہے کہ چین نے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ اپنی سفارتکاری کے لیے ایک مختلف حکمت عملی طے کر رکھی ہے: 'جب آپ کا حریف ایک بڑی سٹریٹیجک غلطی کر رہا ہو تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ آپ اسے یہ غلطی کرتے رہنے دیں۔'

کیا چین کے مفاد میں یہ ہے کہ وہ سفارتی کردار ادا نہ کرے، حالانکہ تیل کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اسے بھی متاثر کر رہا ہے؟

اس سوال کے جواب میں پروفیسر مایولو کہتے ہیں کہ یہ قیمت تو بہت قابل قبول ہے: 'بڑے سٹریٹیجک مفادات کے حوالے سے دیکھا جائے تو امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں الجھا رہنا چین کے لیے کہیں زیادہ دلچسپ ہے، بہ نسبت تیل کے ذرائع کے۔'

رہنماؤں کا کردار

مارگریٹ میکملن کے مطابق تاریخ یہ دکھاتی ہے کہ جنگیں اکثر غرور، وقار کے احساس یا مخالفین کے خوف کے باعث شروع ہوتی ہیں۔ وہ تاریخ سے اس بات کی نشاندہی بھی کرتی ہیں کہ رہنما واقعات کے دھارے کو موڑ سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ 'پہلی عالمی جنگ میں فرانس کے وزیراعظم جارجز کلیمنسو نے کہا تھا: امن قائم کرنا جنگ چھیڑنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔' پروفیسر مارگریٹ کے مطابق اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جب عوام کا بھاری نقصان ہو چکا ہو تو رہنما یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انھیں 'جنگ جیتنے تک اسے جاری رکھنا ہو گا۔' ان کا کہنا ہے کہ غرور رہنماؤں کے فیصلوں میں ایک اہم عنصر بن سکتا ہے۔ روسی صدر ولادیمیر پوتن کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا: 'یوکرین پر حملہ کر کے انھوں نے واضح طور پر ایک بڑی غلطی کی۔' مارگریٹ کے مطابق چار سال پہلے حملے کے آغاز پر پوتن نے کہا تھا کہ ان کا مقصد یوکرین کو 'غیر فوجی اور غیر نازی' بنانا ہے، تاہم ابھی تک روس یہی کہہ رہا ہے کہ یوکرین میں اس کے فوجی اہداف حاصل نہیں ہو سکے۔

برطانیہ کی وزارت دفاع کے اندازوں کے مطابق روس میں اب تک 12 لاکھ 50 ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ برطانوی وزیر دفاع کے مطابق ہلاکتوں کی اصل تعداد اس اندازے سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے اور یہ دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکہ کے مجموعی جانی نقصان سے بھی زیادہ ہے۔ مارگریٹ مزید کہتی ہیں کہ ناکامی تسلیم کرنے یا پیچھے ہٹنے سے انکار کرنے والے رہنما تنازعات کو طول دے سکتے ہیں اور انہیں مزید بڑھا سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں ایڈولف ہٹلر جیسے رہنما بھی شکست یقینی ہونے کے باوجود لڑتے رہے، اس کی وجہ ان کا نظریہ، غرور اور خود فریبی تھی۔ ایسے فیصلے محدود تنازعات کو پھیلا کر تباہ کن جنگوں میں بدل سکتے ہیں۔

کشیدگی میں کمی کے طریقے

مارگریٹ میکملن کے مطابق کشیدگی کم کرنے کے لیے سفارت کاری انتہائی اہم ہے، 'آپ کو دوسرے فریق کے بارے میں جاننا ہوتا ہے اور ان کے ساتھ رابطے میں رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔' وہ وضاحت کرتی ہیں کہ سرد جنگ کے آخری مراحل میں اور نیٹو کے کردار کی وجہ سے تمام فریقوں کے درمیان رابطے بہتر ہوئے تھے۔ ان کا کہنا ہے: 'ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں لوگوں نے کہا کہ ذرا رکیں، یہ صورتحال حد سے زیادہ خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ کشیدگی بہت بڑھ رہی ہے اور درجہ حرارت کم کرنا ضروری ہے۔' جب بڑی طاقتیں ملوث ہوں تو جوہری ہتھیاروں کی موجودگی کشیدگی کم کرنے کی پالیسیوں میں ہمیشہ ایک اہم عنصر ہوتی ہے۔ پروفیسر مایولو بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: 'حزب اللہ، واشنگٹن اور تہران کو یہ بات تسلیم کرنی ہو گی کہ وہ اب مزید کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔'

وہ وضاحت کرتے ہیں کہ مزید جنگ کسی بھی فریق کے لیے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کرے گی، 'پابندیوں میں نرمی، سکیورٹی سے متعلق کچھ انتظامات اور عالمی سیاست میں ایران کے کردار کے حوالے سے کوئی طریقہ کار طے کرنے کی ضرورت ہو گی۔' پروفیسر مایولو کا کہنا ہے کہ صرف ثالثی کے ذریعے ہی جنگ بند ہو سکتی ہے اور پھر اسے زیادہ پائیدار انتظام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

☆.....☆

مارگریٹ کہتی ہیں: 'یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے کہ ایک خطے سے جنگ پھیل کر دوسرے علاقوں تک پہنچ جائے۔ اس کی جزوی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خطے سے باہر کے ممالک تنازع کو اپنے لیے موقع کے طور پر دیکھتے ہیں، کیونکہ یہ ان طاقتوں کو مصروف رکھتا ہے جو عام حالات میں انہیں روک سکتی تھیں۔'

ایران کی حیران کن جنگی حکمت عملی: امریکہ اور اسرائیل کو دھچکا

ٹرمپ کا اعتماد جیت کر پاکستان کیسے ایران جنگ میں ایک غیر متوقع ثالث بنا؟

ساجد خان
(لاہور بیورو)

امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ ماضی قریب میں پاکستانی فوج کے فیلڈ مارشل عاصم منیر کا تذکرہ متعدد مرتبہ 'پسندیدہ فیلڈ مارشل' کے طور پر کرتے رہے ہیں۔ صدر ٹرمپ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ کیسے عاصم منیر 'بہت سے افراد کے مقابلے میں ایران کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔'

جب 28 فروری 2026 کو امریکہ اور اسرائیل نے ایران پر آپریشن ایپک فیوری کے نام سے مشترکہ فضائی حملوں کا سلسلہ شروع کیا، تو دنیا کے بیشتر تجزیہ کاروں کا خیال تھا کہ یہ جنگ چند دنوں یا ہفتوں میں ختم ہو جائے گی۔ ایرانی قیادت کا خاتمہ، جوہری تنصیبات کی تباہی اور فوجی انفراسٹرکچر پر بے پناہ حملوں کے بعد تہران کی حکومت جلد ہی گھٹنے ٹیک دے گی۔ مگر تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ جنگ کے میدان میں سب سے بڑا حیران کن عنصر وہ حکمت عملی ہوتی ہے جو مخالف کو اپنی کمزوریوں کا احساس دلائے بغیر اسے تھکا دے۔

ایران نے نہ صرف اپنی بقا کی جنگ لڑی بلکہ ایسی چالوں سے امریکہ اور اسرائیل کو حیران کر دیا کہ آج، ایک ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود، یہ تنازع ابھی بھی اپنے عروج پر ہے۔ آبنائے ہرمز بند، عالمی تیل کی قیمتیں آسمان چھو رہی ہیں، خلیجی ریاستوں کے امریکی اڈوں پر ایرانی میزائل برس رہے ہیں اور عالمی رائے عامہ امریکہ اور اسرائیل کے خلاف جھوم رہی ہے۔ یہ وہ منظر ہے جس کی ڈونلڈ ٹرمپ نے شاید کبھی توقع نہیں کی تھی۔

اس جنگ کے آغاز سے ہی ایران نے ایک ایسی جنگی حکمت عملی اپنائی جو روایتی فوجی نظریات سے ہٹ کر تھی۔ جب امریکی اور اسرائیلی طیاروں نے تہران، اصفہان، مشہد اور میناب سمیت متعدد شہروں پر بمباری کی اور سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای سمیت اعلیٰ قیادت کے کئی ارکان شہید ہو گئے، تو دنیا نے سوچا کہ ایرانی مزاحمت ٹوٹ جائے گی۔ مگر ایران نے پہلے ہی اپنے کمانڈ سٹرکچر کو مکمل طور پر ڈی سنٹرلائز کر رکھا تھا۔ کمانڈرز اور فیلڈ افسران کو خود مختار فیصلہ سازی کا حق دے دیا گیا تھا تاکہ مرکزی قیادت کے خاتمے کے باوجود جنگ جاری رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی پاسداران انقلاب کے میزائل اور ڈرون یونٹس نے نہ صرف اسرائیل بلکہ خلیجی ریاستوں میں موجود امریکی اڈوں، سعودی، اماراتی اور بحرینی تنصیبات پر بھی یکے بعد دیگرے حملے کیے۔ لبنان، عراق اور یمن کے اتحادی محاذوں سے بھی دباؤ بڑھایا گیا۔ ایک ماہر حکمت عملی برہما چیلانی کے بقول، "ایران نے یہ جنگ جیتنے کے لیے نہیں بلکہ مخالف کو تھکا دینے کے لیے لڑی۔ اس نے امریکہ اور اسرائیل کو ایک ایسے جال میں پھنسا دیا جہاں ہر طرف سے حملے ممکن تھے مگر کوئی واضح فوجی ہدف نظر نہیں آ رہا تھا۔" یہ حکمت عملی نہ صرف فوجی تھی بلکہ نفسیاتی بھی۔ ایران نے آبنائے ہرمز کو بند کر کے عالمی معیشت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تیل کی سپلائی لائن رک جانے سے یورپ، ایشیا اور امریکہ کی مارکیٹیں مندی کا شکار ہوئیں۔ خلیجی ممالک، جو امریکہ کے سب سے بڑے اتحادی سمجھے جاتے تھے، اب خود اپنی سلامتی پر سوال اٹھا رہے ہیں۔

اس حیران کن مزاحمت کا سب سے بڑا ثبوت وہ عوامی ردعمل تھا جو ٹرمپ اور نیتن یاہو نے بالکل متوقع نہیں کیا تھا۔ میناب میں لڑکیوں کے پرائمری سکول پر ہونے والے فضائی حملے میں درجنوں بچیوں سمیت سو سے زائد شہیدوں نے نہ صرف ایران بلکہ پوری دنیا میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف غم و غصے کی لہر پیدا کر دی۔ فرانس، جرمنی، برطانیہ، چین اور کئی اسلامی ممالک نے اسے جنگی جرم قرار دے کر شدید مذمت کی۔ ایرانی عوام، جن سے ٹرمپ نے اپیل کی تھی کہ وہ سڑکوں پر نکل آئیں اور حکومت کا تختہ الٹ دیں، الٹا خامنہ ای کی شہادت کے بعد ایک ہو کر کھڑے ہو گئے۔ یہ وہی خامنہ ای تھے جن کی ہلاکت کو ٹرمپ نے "رجیم چینج" کا سب سے بڑا ہتھیار سمجھا تھا۔ مگر یہ ہلاکت ایران کو متحد کر گئی۔ سٹریٹجک امور کے ماہر حامد رضا عزیزی کا تجزیہ بالکل درست ہے کہ "ایران نے جنگ کو علاقائی تنازع بنا کر امریکہ اور اسرائیل کے وسائل کو کئی محاذوں پر تقسیم کر دیا۔ اب وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اگلا حملہ کہاں سے آئے گا۔" ایرانی میزائلوں نے اسرائیل کے مرکزی علاقوں کو نشانہ بنایا، جبکہ خلیج میں امریکی بحریہ کو شدید نقصان پہنچا۔ یہ سب کچھ ایک ایسے ملک نے کیا جو معاشی پابندیوں، تنہائی اور اندرونی چیلنجز کا شکار تھا۔

اب جب صدر ٹرمپ نے قوم کے نام اپنے تازہ ترین خطاب میں کہا کہ "امریکہ اپنے سٹریٹجک اہداف کے قریب ہے اور آئندہ دو سے تہائی ہفتوں میں شدید حملے کیے جائیں گے" تو عالمی مارکیٹوں نے فوری منفی ردعمل دیا۔ تیل کی قیمتیں آسمان چھو گئیں، اسٹاک مارکیٹیں گر گئیں اور نیٹو کے سابق سفیر آئیو ڈالڈر نے کہا کہ "ٹرمپ کے خطاب نے جنگ کے مقاصد پر شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ اگر ایرانی جوہری صلاحیت، بحریہ اور میزائل تباہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ جنگ کیوں جاری ہے؟" یہ سوال آج ہر عالمی رہنما کے ذہن میں ہے۔ ایران نے نہ صرف فوجی طور پر مزاحمت کی بلکہ سفارتی محاذ پر بھی امریکہ کو الگ تھلگ کر دیا۔ جنیوا میں ہونے والے مبینہ مذاکرات کو ٹرمپ نے حملے کا بہانہ بنا لیا تھا، مگر اب خود ٹرمپ ہی ایرانی رجیم کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ برہما چیلانی اسے "زمینی حقائق جان لینے کے بعد مجبوراً یوٹرن" قرار دیتے ہیں۔

اس پورے تنازع میں ایک حیران کن کردار پاکستان کا بھی سامنے آیا ہے۔ امریکہ اور اسرائیل کے ایران پر حملوں کے بعد جب دنیا اس جنگ کے حل کے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی تو پاکستان نے ایک غیر متوقع ثالث کے طور پر سامنے آیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ حیران کن تھا کہ ایک ملک جو خود انڈیا اور افغانستان کے ساتھ تناؤ کا شکار ہے، وہ کیسے عالمی سطح پر یہ کردار ادا کر رہا ہے۔ مگر شاید اس پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ماضی قریب میں پاکستانی فوج کے فیلڈ مارشل عاصم منیر کا تذکرہ متعدد بار "پسندیدہ فیلڈ مارشل" کے طور پر کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "عاصم منیر بہت سے لوگوں کے مقابلے میں ایران کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔" یہ اعتماد خالی نہیں تھا۔ پاکستان نہ صرف ایران کا ہمسایہ ہے، جس کی سرحد 900 کلومیٹر پر محیط ہے بلکہ دونوں ممالک کے درمیان برادرانہ تعلقات، ثقافتی اور مذہبی جڑیں بھی گہری ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں کوئی امریکی فوجی اڈہ نہیں ہے، جو اسے خلیجی ممالک سے الگ کرتا ہے جو روایتی طور پر ثالثی کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

پاکستان نے اس موقع کو اپنے لیے ایک موقع میں بدل دیا۔ مارچ کے آغاز سے ہی اسلام آباد نے واشنگٹن اور تہران کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ بننا شروع کر دیا۔ مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کا اجلاس منعقد کیا، ٹیلیفونک رابطے جاری رکھے اور نائب وزیراعظم سمیت اعلیٰ حکام چین کے دورے پر بھی گئے تاکہ علاقائی توازن برقرار رہے۔ اٹلانٹک کونسل کے مائیکل کوگلمین کے مطابق، "مشرق وسطیٰ سے باہر اگر کسی ملک پر اس تنازع کا سب سے زیادہ اثر پڑ سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے۔" پاکستان تیل کی درآمدات کا بڑا حصہ آبنائے ہرمز سے لاتا ہے۔ جنگ کی طوالت نے پیٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں 20 فیصد بڑھا دیں۔ معاشی دباؤ کے باوجود پاکستان نے سفارتی طور پر متوازن کردار ادا کیا۔ کراچی میں خامنہ ای کی شہادت پر ہونے والے مظاہروں اور عوامی جذبات کو دیکھتے ہوئے پاکستان کی قیادت جانتی تھی کہ عوام ایران کے ساتھ ہیں۔

فیلڈ مارشل عاصم منیر نے ٹرمپ کے ساتھ براہ راست رابطے قائم کر کے یہ اعتماد مزید مضبوط کیا۔ ٹرمپ نے پاکستان کو "غیر روایتی سفارتی کھیل" کھیلنے والا ملک قرار دیا۔ پاکستان نے ٹرمپ کو امن نوبل انعام کے لیے نامزد کیا، انڈیا کے ساتھ کشیدگی کم کرنے میں مدد کی اور کابل ایئرپورٹ دھماکوں کے ماسٹر مائنڈ کی حوالگی جیسی اقدامات سے واشنگٹن کا دل جیت لیا۔ پروفیسر فرحان صدیقی کے مطابق، "پاکستان نے خود کو وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ درمیانی طاقتیں آج بڑی طاقتوں کے ساتھ چل کر ہی آگے بڑھتی ہیں۔" مگر یہ کردار خطرناک بھی ہے۔ اگر سعودی عرب نے دفاعی معاہدے کے تحت پاکستان سے مدد طلب کی تو مغربی سرحد غیر محفوظ ہو سکتی ہے۔ پھر بھی پاکستان کی کوششیں مخلصانہ ہیں۔ اگر یہ کامیاب ہوئیں تو پاکستان عالمی سفارتکاری میں ایک نئی بلندی حاصل کرے گا۔

پاکستان صرف ایران کا ہمسایہ ہی نہیں ہے، جس کے ساتھ اس کی 900 کلومیٹر طویل سرحد ہے، بلکہ دونوں ممالک کے مابین 'برادرانہ تعلقات' کے علاوہ گہری ثقافتی اور مذہبی جڑیں بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں امریکہ کا کوئی فوجی اڈہ بھی نہیں ہے۔

امریکہ اور اسرائیل کے ایران پر حملے کے بعد اس تنازع کے حل کے لیے پاکستان کی کوششوں پر بہت سے لوگ حیران ہوئے تھے۔ لیکن شاید اِس پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

غیر روایتی سفارتی گیم

یہ ابھی واضح نہیں کہ مذاکرات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ لیکن ایک چیز واضح ہے کہ پاکستان نے اس معاملے کو صدر ٹرمپ سے اپنے تعلقات کو مزید مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ملیحہ لودھی کہتی ہیں کہ صدر ٹرمپ کو امن نوبل انعام کے لیے نامزد کرنا، انڈیا کے ساتھ جنگ بند کروانے کا کریڈٹ دینا اور کابل ایئرپورٹ دھماکوں کے ماسٹر مائنڈ کی امریکہ حوالگی کے ذریعے پاکستان نے صدر ٹرمپ کے لیے جو کچھ کیا وہ ٹرمپ کے لیے بہت اہم تھا۔ کوگلمین کہتے ہیں کہ پاکستان انڈیا کے برعکس غیر روایتی سفارتی کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہے۔ (باقی صفحہ 15 پر)

پاکستان اور طالبان کے درمیان ارمچی میں چینی ثالثی

کیا بیجنگ ڈائیلاگ سے مستقل سیز فائر اور علاقائی امن قائم کر سکے گا؟

شیر دل خان

جمعرات کے روز پاکستان کے دفتر خارجہ کے ترجمان طاہر اندرابی نے ہفتہ وار بریفنگ میں جو اعلان کیا، وہ نہ صرف دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان جاری کشیدگی کی تازہ ترین جھلک تھا بلکہ خطے کی جغرافیائی سیاست میں چین کے ابھرتے ہوئے کردار کی بھی ایک واضح عکاسی۔ پاکستان اور افغانستان (طالبان حکومت) کے درمیان چین کے شہر ارمچی میں ہونے والے مذاکرات کی تصدیق دونوں طرف

سے ہو چکی ہے، جہاں پاکستان کا ایک اعلیٰ سطح کا وفد طالبان کے نمائندوں سے ملاقات کر رہا ہے۔ یہ مذاکرات صرف سرحد پار دہشت گردی کے خاتمے اور باہمی اعتماد کی بحالی تک محدود نہیں، بلکہ ان میں چین کی ثالثی کا کردار اس قدر مرکزی ہے کہ یہ بات چیت علاقائی استحکام، معاشی تعاون اور بیجنگ کی بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کی کامیابی کا مستقبل طے کرنے والی قرار دی جا رہی ہے۔

طاہر اندرابی کا کہنا تھا کہ پاکستان کا موقف واضح ہے: افغانستان کی سرزمین سے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کا استعمال روکنا، اور اس کے لیے طالبان حکومت کو قابل تصدیق اقدامات کرنے ہوں گے۔ آپریشن غضب الحق اب بھی جاری ہے، اور کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دوسری طرف، افغان نائب ترجمان حمد اللہ فطرت نے بھی ایکس پر بیان جاری کر کے تصدیق کی کہ یہ بات چیت چین کی درخواست پر ہو رہی ہے، اور افغانستان کا درمیانی درجے کا وفد باہمی احترام، عدم مداخلت اور تعمیری تفہیم کی بنیاد پر مسائل حل کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پہلی بار نہیں جب چین نے دونوں ملکوں کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کیا ہو، بلکہ گذشتہ ماہ بھی بیجنگ نے ایسے ہی کوششیں کی تھیں، اور اب ارمچی میں یہ عمل ایک نئی کڑی بن گیا ہے۔

اس تجزیاتی رپورٹ میں ہم نہ صرف ان مذاکرات کی تفصیلات پر غور کریں گے بلکہ بیجنگ کے اس کردار کو بھی گہرائی سے سمجھیں گے جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان تنازع کو حل کرنے کی کوششوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا چین واقعی مستقل سیز فائر کروا سکے گا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں تاریخ، معاشی مفادات، سیکورٹی خدشات اور علاقائی جغرافیہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا ہوگا۔ خاص طور پر، چین افغانستان میں کیا تجارتی کردار ادا کر رہا ہے، اسے بھی تفصیل سے دیکھیں گے، کیونکہ بیجنگ کی یہ دلچسپی محض خیر سگالی نہیں بلکہ اس کی بڑی تر حکمت عملی کا حصہ ہے جو بی آر آئی، وسطی ایشیا کی رابطہ کاری اور اپنے مغربی صوبوں کی سلامتی سے جڑی ہوئی ہے۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی تاریخ ہمیشہ سے پیچیدہ رہی ہے، جو ڈیورنڈ لائن کی متنازع حیثیت، قبائلی بندھنوں، اور دہشت گردی کی مشترکہ لعنت سے جڑی ہوئی ہے۔ 2021 میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ تناؤ مزید بڑھا، کیونکہ پاکستان کی تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے افغان سرزمین کو پناہ گاہ بنا لیا، اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں دہشت گرد حملوں میں اضافہ ہوا۔ 2024–2025 کے دوران پاکستان نے سرحد پر آپریشنز تیز کیے، جبکہ طالبان نے انکار کیا کہ وہ کسی بھی گروہ کو پاکستان کے خلاف استعمال ہونے دیتے ہیں۔ اس پس منظر میں چین کا کردار ابھرا، کیونکہ بیجنگ نہ صرف دونوں ملکوں کا اہم معاشی پارٹنر ہے بلکہ اس کے پاس دونوں پر اثر و رسوخ بھی ہے۔ پاکستان کے ساتھ تو چین کا تعلق اسٹریٹجک ہے، جو سی پیک (چین پاکستان اکنامک کوریڈور) کی شکل میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری پر مبنی ہے، جبکہ افغانستان میں بیجنگ نے طالبان حکومت کو تسلیم کر کے اور سفارتی تعلقات قائم کر کے ایک منفرد پوزیشن حاصل کر لی ہے۔

ارمچی میں ہونے والے یہ مذاکرات چین کے شہر میں اس لیے ہو رہے ہیں کہ بیجنگ نے خود کو ثالث کے طور پر پیش کیا ہے، اور دونوں فریقین نے اسے قبول کیا۔ طالبان کے ذرائع کے مطابق افغان وزارت خارجہ، خفیہ ایجنسی اور وزارت داخلہ کے اہلکار بھی شامل ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سیکورٹی مسائل مرکزی ہیں۔ پاکستان کا وفد اپنے بنیادی خدشات کی توثیق کر رہا ہے کہ افغان سرزمین سے دہشت گرد گروہوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ عمل گذشتہ ماہ کی کوششوں کا تسلسل ہے، جہاں چین کی وزارت خارجہ نے کہا تھا کہ اس کا نمائندہ خصوصی برائے افغانستان دونوں ممالک کے درمیان ثالثی کر رہا ہے۔

ماہرین کا ماننا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں، چین کا پاکستان اور افغانستان کے درمیان ثالثی کا کردار 2017 سے چلنے والے سہ فریقی گروپ کا حصہ ہے، جو معیشت اور سیکورٹی دونوں پر محیط ہے۔ سینئر صحافی طاہر خان کے مطابق، چین ہمیشہ سے دونوں ملکوں کے اچھے تعلقات کا خواہاں رہا ہے کیونکہ کشیدگی اس کے معاشی منصوبوں کو متاثر کرتی ہے۔ افغانستان میں پاکستان کے سابق سفیر منصور خان کہتے ہیں کہ خطے میں ایران، امریکہ اور اسرائیل کی موجودہ صورتحال میں چین مفاہمت کی کوشش کر رہا ہے تاکہ علاقائی استحکام برقرار رہے۔

چین پاکستان اور افغانستان کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے میں سب سے بہتر پوزیشن میں ہے کیونکہ اس کے پاس دونوں پر دباؤ ڈالنے کی صلاحیت ہے۔ پاکستان پر تو اس کا اثر و رسوخ واضح ہے، جہاں سی پیک اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہے، اور چین نے بار بار پاکستان سے چینی شہریوں اور منصوبوں کی سیکورٹی کا مطالبہ کیا ہے۔ افغانستان میں بھی بیجنگ نے طالبان حکومت کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کیے ہیں؛ وہ پہلا ملک تھا جس نے طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سفیر بھیجا اور طالبان کے سفیر کو تسلیم کیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز اسلام آباد کے ریسرچر اسد اللہ خان کے مطابق، چین خطے کی بڑی طاقت ہے اور اس کے سی پیک جیسے منصوبوں سے مفادات جڑے ہیں، اس لیے وہ نہ صرف مذاکرات کی میز پر لا سکتا ہے بلکہ قابل عمل میکانزم پر بھی قائل کر سکتا ہے۔ تجزیہ کار افتخار فردوس کا کہنا ہے کہ یہ سہ فریقی عمل معیشت اور سیکورٹی دونوں پر مبنی ہے، اور ایران کی حالیہ صورتحال کی وجہ سے تاخیر ہوئی تھی۔

چین افغانستان میں تجارتی کردار ادا کرنے میں سب سے آگے ہے، اور یہ اس کی ثالثی کی بنیادی وجہ بھی ہے۔ طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد بیجنگ نے افغانستان کو بی آر آئی میں شامل کرنے کی کوششیں تیز کیں، خاص طور پر واخان کوریڈور کے ذریعے جو افغانستان کو چین سے جوڑتا ہے۔ 2024 میں چین نے افغان برآمدات پر صفر ٹیرف (tariff-zero) کا اعلان کیا، جو تمام ٹیکس ایبل اشیاء پر لاگو ہوتا ہے، اور اس سے دوطرفہ تجارت بڑھ رہی ہے۔ اہم منصوبوں میں میس آینک تانبے کی کان شامل ہے، جو دنیا کی دوسری بڑی تانبے کی کان ہے اور 2007 سے چین کی میٹالرجیکل کارپوریشن آف چین (ایم سی سی) اسے تیار کر رہی ہے۔ 2024–2025 میں اس پر کام تیز ہوا ہے، اور طالبان اسے معاشی بحالی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس سے سالانہ 250–300 ملین ڈالر کی آمدنی متوقع ہے، جو 11.5 ملین ٹن تانبے کے ذخائر پر مبنی ہے۔ امو دریا تیل کے میدان میں بھی 2023 میں 540 ملین ڈالر کا معاہدہ ہوا، جہاں چینی کمپنیاں تیل نکال رہی ہیں۔ لیتھیم اور دیگر نایاب معدنیات میں بھی 10 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی پیشکش کی گئی ہے۔

چین کے تجارتی مفادات صرف معدنیات تک محدود نہیں، بی آر آئی کے تحت افغانستان کو سی پیک کا توسیعی حصہ بنانے کی پلاننگ جاری ہے، جو تجارت، ٹرانزٹ اور انفراسٹرکچر کو جوڑے گی۔ 2025 میں چین نے افغان زراعت میں بھی دلچسپی دکھائی، جیسے کابل، تخار اور بدخشاں میں تین جدید کولڈ سٹوریجز بنانے کا اعلان۔ دوطرفہ تجارت اب ایک بلین ڈالر سالانہ تک پہنچ چکی ہے، اور بیجنگ طالبان کو امداد بھی دے رہا ہے۔ تاہم، سیکورٹی خدشات کی وجہ سے سرمایہ کاری احتیاط سے ہو رہی ہے۔ ٹی ٹی پی اور ایسٹرن ترکستان اسلامک موومنٹ (ای ٹی آئی ایم) جیسے گروہ چینی مفادات کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ افتخار فردوس کے مطابق، چینی ایغور عسکریت پسندوں کے حوالے سے تحفظات اب بھی موجود ہیں، لیکن بیجنگ طالبان کو سفارتی طور پر شامل رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ طاہر خان کہتے ہیں کہ چین کا خیال ہے کہ موجودہ صورتحال اس کے معاشی مفادات کے خلاف ہے، کیونکہ تجارت، ٹرانزٹ اور بی آر آئی منصوبے رکے ہوئے ہیں۔

چین کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان استحکام اس کے لیے لازمی ہے۔ بیجنگ کا موقف ہے کہ اگر کشیدگی جاری رہی تو سی پیک متاثر ہوگا، جو اس کی بڑی تر حکمت عملی کا حصہ ہے۔ افغانستان میں چین نے متعدد انفراسٹرکچر منصوبے شروع کیے ہیں، اور کابل کو امداد دے رہا ہے۔ اسد اللہ خان کا کہنا ہے کہ چین پاکستان کی بات کو ترجیح دیتا ہے، اس لیے وہ بہترین ثالث ہے۔ تاہم، ماضی کی کوششیں ناکام کیوں ہوئیں؟ ترکی اور خلیجی ممالک کی ثالثی ناکام رہی کیونکہ پاکستان نے تحریری ضمانت کا مطالبہ کیا، جو طالبان نے انکار کر دیا۔ طالبان کا موقف ہے کہ وہ پاکستان کے اندرونی مسائل کی ذمہ دار نہیں، جبکہ پاکستان چاہتا ہے کہ گروہوں کو پکڑا جائے اور غیر مسلح کیا جائے۔ افتخار فردوس کے مطابق، طالبان کے لیے مشترکہ بارڈر میکانزم ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے جیسا ہے، جو ان کے نظریاتی فرض کے خلاف ہے۔

کیا پاکستان اور افغانستان کے درمیان مستقل جنگ بندی ممکن ہے؟ اسد اللہ خان کہتے ہیں اگر پاکستان اور افغانستان اپنے سیکورٹی اور تجارتی مسائل کے معاملے میں حد متعین کر لیں کہ وہ سیکورٹی مسائل کو تجارتی معاملات پر اثر انداز ہونے نہیں دیں گے تو وہ جنگ بندی دیرپا ثابت ہو سکتی ہے۔ طاہر خان کہتے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ چین کے لیے بھی یہ ایک بڑا چیلنج ہوگا کہ کیسے ان دونوں ملکوں کو پیچھے ہٹنے اور اپنے موقف میں نرمی لانے کے لیے راضی کرے۔ دوسری جانب افتخار فردوس کا کہنا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان اس وقت تک مستقل جنگ بندی ممکن نہیں جب تک دونوں فریق ایک قابل تصدیق طریقہ کار پر متفق نہ ہو جائیں۔ فی الحال یہ کافی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ جس چیز کا زیادہ امکان ہے وہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان وقتاً فوقتاً وسیع اور محدود پیمانے پر کشیدگی جاری رہے گی۔

(باقی صفحہ 15 پر)

> یہ مذاکرات صرف سرحد پار دہشت گردی کے خاتمے اور باہمی اعتماد کی بحالی تک محدود نہیں، بلکہ ان میں چین کی ثالثی کا کردار اس قدر مرکزی ہے کہ یہ بات چیت علاقائی استحکام، معاشی تعاون اور بیجنگ کی بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کی کامیابی کا مستقبل طے کرنے والی قرار دی جا رہی ہے۔

تحریر: خرم شہزاد

صحرا کی آغوش میں ایک خواب کی سلطنت

ری پبلک آف سلوجامستان

جہاں ریت کے ذروں پر تخیل کی بادشاہی قائم ہے، مزاح کی آوازیں گونجتی ہیں اور ہر دل ایک نئی آزادی کا پرچم لہراتا ہے

امریکہ کے وسیع و عریض صحراؤں کی گود میں، جہاں سورج کی تیز دھوپ ریت کے تپتے سمندر کو چومتی ہے اور ہوا میں کھجور کے باغات کی مہک گھل مل جاتی ہے، ایک ایسی منفرد اور جادوئی ریاست وجود میں آئی ہے جو نہ صرف ایک جغرافیائی مقام ہے بلکہ انسانی تخیل کی سب سے خوبصورت اور رنگا رنگ تجربہ گاہ بھی ہے۔ یہ ری پبلک آف سلوجامستان ہے، ایک ایسا مائیکرونیشن جو بظاہر ایک بنجر اور نظر انداز کیے جانے والے علاقے میں قائم نظر آتا ہے مگر اندر سے ایک مکمل، زندہ دل اور مزاح سے بھرپور دنیا ہے جہاں قوانین کا مزاج عجیب و غریب ہے، جہاں کروکس پہننے کی ممانعت ہے، جہاں ریپلائی آل ای میل بھیجنا ایک سنگین جرم شمار ہوتا ہے اور جہاں قومی جانور ایک چالاک ریکون ہے جو صحرا کی ریتوں میں اپنی چالاکی سے سب کو حیران کرتا رہتا ہے۔ یہ ریاست کیلیفورنیا کی دل کش کوچیلا ویلی اور میکسیکو کی سرحد کے درمیان ایک 11 ایکڑ پر پھیلے ہوئے صحرا میں بسا ہوا ہے، جہاں دور سے ایک آبدوز جیسی عجیب سی شکل نظر آتی ہے جو اس جگہ کو مزید پراسرار اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ جب آپ اس بنجر زمین پر قدم رکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ حقیقی دنیا کی زنجیروں سے آزاد ہو کر کسی نئے، خیالی اور پرامن عالم میں داخل ہو گئے ہوں، جہاں ہر چیز مزاح، تخیل اور آزادی کے رنگوں سے رنگا ہوا ہے۔ یہاں ٹاکوز کھانے کے لیے تیز رفتار چلنے کی اجازت ہے، جھنڈے لہراتے ہیں، پاسپورٹ جاری ہوتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے سے بغیر کسی سیاسی جھگڑے کے صرف خوشی اور بھائی چارے کے ساتھ جڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ ممکن ہوا ہے ایک ایسے شخص کی وجہ سے جس کا نام رینڈی ولیمز ہے، جو خود کو سلطان آف سلوجامستان کہتے ہیں اور جن کی کہانی نہ صرف ایک سفر کی کہانی ہے بلکہ انسانی ذہن کی لامحدود تخلیقی صلاحیتوں کا ایک شاندار مرقع بھی ہے۔

رینڈی ولیمز، جو سان ڈیاگو کے دو بڑے ریڈیو سٹیشنوں کے پروگرام ڈائریکٹر ہیں اور ریڈیو پر آرڈب کے نام سے مشہور ہیں، ایک ایسے شخص ہیں جن کے دل میں بچپن سے ہی تخلیق کا جادو گھر کر چکا تھا۔ وہ سنہ 1994 سے سنڈے نائٹ سلوجیمز نامی ریڈیو شو کی میزبانی کر رہے ہیں جو آج دنیا بھر کے 250 سے زائد ریڈیو سٹیشنوں پر نشر ہوتا ہے اور لاکھوں سننے والوں کے دلوں کو چھوتا ہے۔ ان کا جنون صرف سفر کا نہیں تھا بلکہ دنیا کے ہر تسلیم شدہ ملک کو دیکھنے، اس کی مٹی کو چھونے اور اس کی ثقافت کو اپنے اندر اتارنے کا تھا۔ برسوں کی محنت، لاکھوں میل کا سفر اور ان گنت یادوں کے بعد سنہ 2020 کے آغاز تک وہ تمام ممالک کا دورہ کر چکے تھے، سوائے ایک ملک کے جو ان کی فہرست میں باقی رہ گیا تھا۔ مگر پھر وہ عالمی وبا آ گئی جس نے پوری دنیا کو لاک ڈاون کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ ہوائی اڈے خاموش ہو گئے، سرحدیں بند ہو گئیں اور لوگ اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ رینڈی بھی اسی بے چینی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے پاس وقت تو بہت تھا مگر جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان کا ذہن، جو کبھی رکتا ہی نہیں تھا، ہر صبح ایک نئے خیال کو جنم دیتا۔ ایک دن، جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھے دنیا بھر کی آمریتوں کے پروپیگنڈا مواد اور یادگاروں کو دیکھ رہے تھے، ان کے دل میں ایک چنگاری سی جل اٹھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر میں کسی اور ملک کا سفر نہیں کر سکتا تو کیوں نہ اپنا ہی ایک ملک بنا لوں، جہاں سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو، جہاں قوانین میں مزاح ہو، جہاں لوگ آزاد ہو کر سانس لیں اور جہاں تخیل کی کوئی حد نہ ہو۔ یہ خیال ان کے لیے ایک سب سے شاندار موقع تھا کیونکہ بچپن سے ہی وہ تخلیقی کاموں سے محبت کرتے تھے، چاہے وہ تحریریں لکھنا ہو، ڈرائنگز بنانا ہو یا کلاس کے پراجیکٹس کی تصویریں تیار کرنا ہو۔

انہوں نے اپنے سب سے قریبی دوست مارک کورونا کو فون کیا اور پورا منصوبہ بتایا۔ مارک نے ساری بات سنی تو ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ انہیں کارٹون فیملی گائے کا وہ منظر یاد آ گیا جہاں پیٹر اپنا ملک پیٹوریا بنا لیتا ہے۔ مارک نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ہاں ہاں ٹھیک ہے میرے دوست، مگر یہ نیا ملک تم بناؤ گے کہاں؟ اپنے گھر کے بیٹھک میں؟ مگر رینڈی نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے رئیل اسٹیٹ کی ویب سائٹس کھولنی شروع کیں اور ایک ایسی زمین تلاش کرنی شروع کی جو ان کی تمام شرائط پر پورا اترتی ہو۔۔ کم از کم پانچ ایکڑ، پکی سڑک تک رسائی اور سان ڈیاگو سے زیادہ دور نہ ہو۔ کئی دن کی تلاش کے بعد ان کی نظر ایک پلاٹ پر پڑی۔ یہ ایک بنجر، ریت سے بھرا ہوا، جھاڑیوں اور پتھروں سے ڈھکا ہوا 11 ایکڑ کا ٹکڑا تھا جس کی قیمت صرف 19,500 ڈالر تھی۔ پہلی نظر میں ہی یہ انہیں اپنا لگا۔ یہ محبت پہلی نظر کی تھی، ایک ایسی

محبت جو روح کو چھو جائے۔ سنہ 2021 میں انہوں نے اسے خرید لیا۔ پھر دوست مارک سے کہا کہ فینکس سے ایک ڈیسک لے آؤ اور جنوبی کیلیفورنیا پہنچا دو۔ ڈیسک کو صحرا کے بیچوں بیچ رکھا گیا اور پھر حد بندی شروع ہو گئی۔ کیلیفورنیا سٹیٹ روٹ 78 پر سائنز لگائے گئے جن پر ری پبلک آف سلوجامستان کا نام چمک رہا تھا۔ یہ نام ابتدا میں صرف مذاق میں تجویز کیا گیا تھا مگر جلد ہی یہ بورڈ پر بھی کندہ کر دیا گیا اور سارے علاقے کا نشان بن گیا۔

مقامی حکام نے فوراً نوٹس لے لیا کیونکہ سائنز سڑک کے بہت قریب تھے۔ رینڈی نے انہیں تھوڑا سڑک سے ہٹا کر لگوا دیا تاکہ کاؤنٹی کے قواعد کی بھی پاسداری ہو اور اپنے نئے ملک کا اعلان بھی بھرپور انداز میں ہو سکے۔ لوگ گاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے حیران ہوتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ سوچتے کہ شاید یہ کوئی دہشت گردوں کا اڈا ہے، مگر یہ تجسس ہی ان کی مقبولیت کا باعث بنا۔ پہلے عارضی سرحدی چیک پوائنٹ لگا، پھر جھنڈے، پھر پاسپورٹس۔ جلد ہی یہ جگہ ایک حقیقی ملک کی شکل اختیار کر گئی۔ رینڈی نے خود کو سلطان قرار دیا اور ایک ڈرامائی انداز اپنا لیا۔۔ سیاہ چشمے، استری شدہ یونیفارم، چمک دمک والا لباس جو لیبیا کے سابق آمر معمر قذافی کے فوجی انداز سے ملتا جلتا تھا۔ ان کی آواز ایک خاص لہجہ اختیار کر لیتی، جسے وہ جنرل فارن ایکسنٹ کہتے ہیں۔۔ ایک ایسا لہجہ جو غیر ملکی لگتا ہے مگر کسی مخصوص ملک سے تعلق نہیں رکھتا۔ اب پانچ سال بعد سلوجامستان ایک مکمل مائیکرونیشن بن چکا ہے۔ یہاں 25 ہزار سے زائد شہری ہیں جو 120 ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تعداد بعض تسلیم شدہ ممالک جیسے ویٹیکن سٹی، تووالو اور پلاؤ سے بھی زیادہ ہے۔ شہریت حاصل کرنا بہت آسان ہے۔۔ ایک سادہ آن لائن فارم بھریں اور آپ سلوجامستانی شہری بن جائیں۔

اس آمریت میں عہدے بھی دستیاب ہیں مگر ان کے لیے تھوڑی سی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر آپ نارتھ کیرولائنا میں بیٹھے ہیں اور اپنا لنکڈ اِن پروفائل مزید متاثر کن بنانا چاہتے ہیں تو بس ایک چھوٹی سی رقم دیں اور آپ پارلیمنٹ کے رکن بن جائیں۔ سفیر بننے کے لیے ماہانہ 10 سے 20 ڈالر درکار ہیں مگر عام شہریت بالکل مفت ہے۔ یہاں مختلف ریاستوں میں تقسیم کیا گیا ہے جیسے ڈیلینڈیا، بکسلو ینیا اور کونگڈم آف ہاٹ ڈیمناشان۔ قومی ترانہ بھی تیار ہے جو ایلٹن جان کے راکٹ مین کی دھن پر مبنی ہے: سلوجامستان آئی تھنک اٹس گوئنگ تو بی این اے ایم ٹیکس۔ تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔۔ جیسے پہلے بحری جہاز کی افتتاحی تقریب جسے ایس ایس ہیڈ ایسن کہا جاتا ہے اور جو سمگلروں سے حفاظت کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ کچھ لوگ تجسس سے، کچھ تفریح کے لیے اور کچھ دنیا کے ہنگاموں سے تھوڑی سی نجات پانے کے لیے شہری بنتے ہیں۔ سلطان کہتے ہیں کہ آج کے دور میں جب فیس بک کھولتے ہی لوگ سیاست کی وجہ سے دوست اور خاندان کھو رہے ہوتے ہیں، سلوجامستان ایک پرامن پناہ گاہ ہے۔ یہاں کسی بھی قسم کی حقیقی سیاست پر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ تقریباً 50 فیصد شہری امریکی ہیں جو اپنے ملک کی سیاست سے مایوس ہیں۔ مگر یہ کشش سرحدوں تک محدود نہیں۔۔ بنگلہ دیش سے بھی درخواستیں بڑھ رہی ہیں۔

سٹیفنی ہیڈن جیسی شہری کہتی ہیں کہ جب انہوں نے جیپرڈی شو میں اس ملک کا ذکر سنا تو ان کی زندگی بدل گئی۔ وہ لانگ بیچ ٹریول اینڈ ایڈوینچر شو میں سلطان تک پہنچیں اور اب کہتی ہیں کہ سلطان نے ان کی زندگی میں راحت اور خوشی بھر دی ہے۔ ہزاروں دوسرے شہری بھی اس سے

> **اس خودساختہ ’ملک‘ کے 25 ہزار سے زیادہ شہری ہیں جنھوں نے اس ملک میں قائم فرضی آمریت سے وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔ یہاں عجیب و غریب قوانین نافذ ہیں مثلاً ’کروکس پہننا‘ اور ’ریپلائی آل ای میل‘ بھیجنا سختی سے ممنوع ہے۔**

> **یہ ریاست کیلیفورنیا کی کوچیلا ویلی اور میکسیکو کی سرحد کے درمیان ایک بنجر صحرا میں واقع ہے۔ یہ علاقہ کھجور کے باغات، جھاڑیوں اور تیز دھوپ سے جھلسے ہوئے ریتیلے میدانوں پر مشتمل ہے۔ دور سے ایک آبدوز جیسی چیز بھی دکھائی دیتی ہے جو اس جگہ کو مزید دلچسپ بنا دیتی ہے۔**

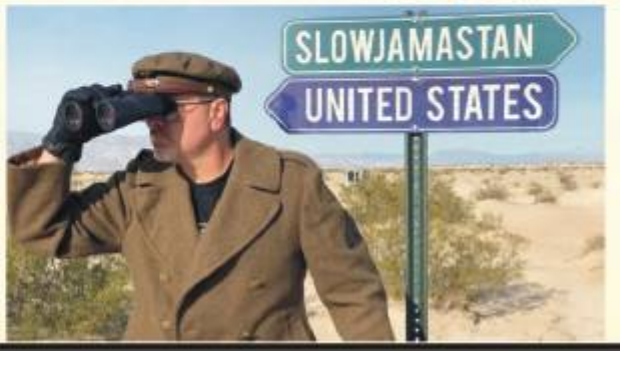

ایران کی آبنائے باب المندب تجارتی راستے کی ممکنہ بندش کی دھمکیاں

ایران واضح کر چکا ہے کہ اگر امریکہ کی جانب سے ایران کے خلاف کوئی زمینی کارروائی کی گئی تو وہ جنگ میں 'دیگر محاذ' کھول سکتا ہے۔

ایران پہلے ہی آبنائے ہرمز کو مؤثر طور پر بند کر چکا ہے، جسکے باعث بحری ٹریفک شدید متاثر ہے، اور اب ایران آبنائے 'باب المندب' کو متاثر کرنیکی دھمکی دے رہا ہے۔ باب المندب، خلیج عدن کو بحیرہ احمر اور پھر نہر سویز سے جوڑتی ہے۔

مقصود خالد

عالمی تجارت کی اس دل کش اور حکمت بھری کہانی میں، جہاں بحروں کی لہریں نہ صرف مال و اسباب کی نقل و حرکت کا ذریعہ بنتی ہیں بلکہ طاقت کے توازن، معاشی استحکام اور بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیوں کو بھی اپنی گود میں سموئے رکھتی ہیں، آبنائے باب المندب ایک ایسا جادوئی مقام بن کر ابھرتا ہے جو اپنی 36 کلومیٹر کی چوڑائی کے باوجود دنیا کی سب سے مصروف ترین تجارتی شاہراہوں میں شمار ہوتا ہے، اور اس کی ممکنہ بندش کی دھمکیاں عالمی معیشت کے قلب کو ہلا کر رکھنے والی ہیں، کیونکہ ایران کی جانب سے بحیرہ احمر کے اس اہم راستے کو بند کرنے کی دھمکیوں نے نہ صرف عالمی تجارت میں مزید رکاوٹوں کے خدشات کو آسمان کی بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا دیا ہے بلکہ تاریخ کے ان گنت سبقوں کو بھی تازہ کر دیا ہے جو بتاتے ہیں کہ سمندری راستوں کا کنٹرول کس طرح سلطنتوں کے عروج و زوال کا باعث بن سکتا ہے، ایران جو پہلے ہی آبنائے ہرمز کو مؤثر طور پر بند کر چکا ہے اور بحری ٹریفک کو شدید متاثر کر رہا ہے، اب باب المندب کو بھی اپنی دھمکیوں کا نشانہ بنا رہا ہے، یہ آبنائے جو خلیج عدن کو بحیرہ احمر اور پھر نہر سویز سے جوڑنے کا سنہرا کام سرانجام دے رہی ہے، ایران نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ اگر امریکہ کی جانب سے اس کے خلاف کوئی زمینی کارروائی ہوئی تو وہ جنگ کے دیگر محاذ کھولنے سے ہچکچائے گا، پاسداران انقلاب سے منسلک تسنیم نیوز ایجنسی نے ایک ایرانی فوجی ذریعے کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ باب المندب دنیا کی سٹریٹجک آبناؤں میں سے ایک ہے اور ایران کے پاس اسے خطرے میں ڈالنے کی مکمل خواہش اور صلاحیت دونوں موجود ہیں، ماضی قریب میں بھی ایران نے دھمکی دی تھی کہ اگر امریکہ اس کے خارگ جزیرے پر حملہ کرے گا تو وہ باب المندب کو متاثر کر دے گا، جبکہ دوسری جانب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے صرف دو روز قبل ہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایران کا تیل حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں جزیرہ خارگ پر قبضے پر غور کر رہے ہیں، یہ تمام تر حرکتیں ایک ایسے عالمی منظرنامے کو جنم دے رہی ہیں جہاں طاقت کا کھیل نہ صرف تیل اور گیس کی ترسیل بلکہ پوری انسانیت کی روزمرہ زندگی کو متاثر کر سکتا ہے۔

آبنائے باب المندب کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس کی جغرافیائی شان و شوکت اور تاریخی اہمیت پر گہری نظر ڈالنا ضروری ہے، یہ آبنائے یمن کے ساتھ بحیرہ احمر کے کنارے پر واقع ہے جبکہ جبوتی اور اریٹیریا کے افریقی کناروں سے مل کر ایک ایسا قدرتی پل بناتی ہے جو بحر ہند اور خلیج عدن سے آنے والی بحری ٹریفک کو نہر سویز تک رسائی فراہم کرتی ہے، تھا بلکہ لاگت کو بھی کم کرتا تھا، آج بحیرہ احمر میں موجود یہ آبنائے دنیا کے مصروف ترین راستوں میں سے ایک ہے اور تقریباً ایک چوتھائی عالمی بحری ٹریفک اسی سے گزرتی ہے، آبنائے ہرمز سے دنیا کو سپلائی ہونے والے تیل کا 20 فیصد حصہ تو گزرتا ہی ہے، اس کے علاوہ باب المندب کی ممکنہ بندش مزید 12 فیصد عالمی تیل کی ترسیل کو شدید متاثر کر سکتی ہے، امریکی انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن کے مطابق روزانہ تقریباً 50 لاکھ بیرل تیل جو مشرق وسطیٰ اور ایشیائی ممالک سے آتا ہے اور مغرب کی جانب جاتا ہے، اسی آبنائے سے گزرتا ہے، مزید برآں عالمی مائع قدرتی گیس یعنی ایل این جی کی آٹھ فیصد ترسیل بھی اسی راستے سے ہوتی ہے، آبنائے ہرمز کے مؤثر طور پر بند ہونے کے بعد بحیرہ احمر نے عالمی تجارت میں مزید اہمیت حاصل کر لی ہے اور سعودی عرب نے باب المندب کو بحیرہ احمر سے سعودی تیل کی ترسیل کے لیے ایک اہم گزرگاہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، ریاض اپنی مشرقی آئل فیلڈز سے روزانہ لاکھوں بیرل خام تیل پائپ لائن کے ذریعے بھیجتا ہے، خام تیل اور گیس کے علاوہ یہ آبنائے مشرق اور مغرب کے درمیان مرکزی تجارتی رابطے کا حصہ بھی ہے جہاں سے روزانہ درجنوں کارگو جہاز گزرتے ہیں جو نہ صرف ایشیائے ضروریہ بلکہ جدید ٹیکنالوجی کے آلات، زرعی اجناس اور صنعتی خام مال کی نقل و حمل کا ذریعہ بنتے ہیں، اس طرح یہ آبنائے نہ صرف معاشی شاہ رگ ہے بلکہ عالمی امن و استحکام کی بھی ضامن ہے، کیونکہ اس کی بندش سے پیدا ہونے والا خلا پوری دنیا کی سپلائی چین کو متاثر کر سکتا ہے اور لاکھوں لوگوں کی روزی روٹی پر سیاہ بادل چھا سکتے ہیں۔

حوثیوں کا کردار اس پورے تناظر میں انتہائی اہم اور دلچسپ ہے، کیونکہ آبنائے باب المندب پر کسی بھی ممکنہ حملے کا امکان زیادہ تر انہی ایران حمایت یافتہ باغیوں کی جانب سے ہے جو یمن میں ایک طاقتور سیاسی اور عسکری گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں، خبر رساں ادارے روئٹرز سے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کرتے ہوئے ایک حوثی رہنما نے کہا کہ وہ عسکری طور پر مکمل طور پر تیار ہیں تاکہ تہران کی حمایت میں اس آبنائے کو نشانہ بنا سکیں، یاد رہے کہ 28 مارچ کو حوثیوں نے اسرائیل پر حملہ کیا جو ایران، امریکہ اور اسرائیل کی جنگ میں ان کی جانب سے پہلا باضابطہ حملہ تھا، اسرائیل نے بتایا کہ انہوں نے یمن سے آنے والے دو میزائل مار گرائے، حوثی گروہ یمن میں بحیرہ احمر کے ساحل پر قابض ہے اور غزہ جنگ کے دوران بھی اس نے باب المندب کو نشانہ بنایا تھا، اس نوعیت کی کارروائیوں میں انہوں نے میزائلوں اور ڈرونز کے ذریعے 100 سے زائد تجارتی جہازوں پر حملے کیے جن کے نتیجے میں دو جہاز ڈوب گئے اور چار سیلرز ہلاک ہوئے، نومبر 2023 میں انہوں نے ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہوئے بحیرہ احمر میں جاپان آپریٹڈ اور برطانوی ملکیت والے کارگو جہاز گیلیکسی لیڈر کو ہائی جیک کر لیا تھا، اگرچہ حوثیوں نے دعویٰ کیا کہ وہ صرف اسرائیل سے تعلق رکھنے والے جہازوں کو نشانہ بنا رہے ہیں لیکن ان حملوں کو بلاامتیاز قرار دیا گیا جس کے نتیجے میں دنیا کی کئی بڑی شپنگ اور آئل کمپنیوں نے اس علاقے سے گزرنا معطل کر دیا، یہ حملے بالآخر اس وقت کم ہوئے جب امریکہ نے دعویٰ کیا کہ حوثی پیچھے ہٹ گئے جبکہ حوثیوں نے جوابی دعویٰ کیا کہ اصل میں امریکہ ہی پیچھے ہٹا، تاہم تجزیہ کاروں کو خدشہ ہے کہ ایران کی جنگ کے تناظر میں یہ حملے دوبارہ شروع ہو سکتے ہیں، بی بی سی کی نامہ نگار برائے بین الاقوامی امور لز ڈوسیٹ کا کہنا ہے کہ ہمیشہ امکان ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ اگر ایران کی جنگ طول پکڑے تو یمن کے حوثی اس میں شامل ہو جائیں گے، انہوں نے مزید کہا کہ حوثی جو شمال مغربی یمن میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں اب تک اپنا سب سے طاقتور ہتھیار استعمال نہیں کیا یعنی باب المندب میں ٹریفک کو متاثر کرنے کی صلاحیت، 26 فروری کو امریکی محکمہ ٹرانسپورٹیشن کی میری ٹائم ایڈمنسٹریشن نے ایک نوٹس میں کہا تھا کہ اگرچہ حوثی دہشت گرد گروہ نے اکتوبر 2025 میں اسرائیل اور غزہ کے درمیان جنگ بندی کے بعد سے تجارتی جہازوں پر حملہ نہیں کیا لیکن وہ اب بھی اس خطے میں امریکی اثاثوں بشمول تجارتی جہازوں کے لیے خطرہ ہیں، اس طرح حوثیوں کی سرگرمیاں نہ صرف علاقائی تنازع کو بڑھا رہی ہیں بلکہ عالمی سطح پر ایک نئی سرد جنگ کی یاد تازہ کر رہی ہیں جہاں چھوٹے گروہ بھی بڑی طاقتوں کو چیلنج کر سکتے ہیں۔

عالمی جہاز رانی کی صنعت اس دباؤ میں آ کر جیسے سانس لینے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، کیونکہ باب المندب کا مطلب عربی زبان میں آنسوؤں کا دروازہ یا غم کا دروازہ ہے جو اس کی اندرونی خطرات کی عکاسی کرتا ہے جیسے سمندر کے تیز دھارے، غیر متوقع ہوائیں، قزاقی کے خطرات اور علاقائی تنازعات، سنہ 2008 سے 2012 کے درمیان اس آبنائے اور اس کے گرد پانیوں میں قزاقی کے متعدد واقعات پیش آئے جن میں زیادہ تر صومالی گروہوں نے تجارتی جہازوں کے عملے کو اغوا کر کے تاوان طلب کیا اور ان واقعات نے عالمی برادری اور شپنگ کمپنیوں کو اس خطے میں سکیورٹی بڑھانے پر مجبور کیا، (باقی صفحہ 15 پر)

ایمان کامران

مشرق کہانی میگزین

انتخاب ساجد خان

گرافکس خرم شہزاد

فیشن کا نیا ٹرینڈ "گرمی کے موسم میں لان کی بہار"

فیشن کا نیا ٹرینڈ ''گرمی کے موسم میں لان کی بہار'' کا ہے، خواتین کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں، انہیں تو بس لان کا جوڑا ہی گرمی کے موسم میں آسودگی بخشتا ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں بھی سستی سے سستی اور مہنگی سے مہنگی یعنی ہر کوالٹی کی لان مارکیٹ میں دستیاب ہے، پتیوں، بوٹیوں، پھولوں، پھلوں، تتلیوں اور دیگر دلکش ڈیجیٹل پیٹرن کی حامل لان نے خواتین کی بھرپور توجہ حاصل کر رکھی ہے۔ خواتین گرمی کے موسم میں لان اور کاٹن کا انتخاب کرتی ہیں لہٰذا موسم کی مناسبت سے وہ خاص مواقع پر بھی بھاری کامدار ملبوسات کے بجائے پرنٹڈ شرٹس کو ترجیح دے رہی ہیں۔ ملک کے تمام معروف فیشن ڈیزائنرز اسٹائلش طرز کی شارٹ فراک تیار کر رہے ہیں جن پر ڈیجیٹل پرنٹ کے ساتھ ہلکی کڑھائی بھی موجود ہے جنہیں پیلم، ٹیولپ اور پینسل ٹراؤزر کے ساتھ پہنا جا رہا ہے، اہم یہ ہے کہ ایسے ملبوسات خریدتے وقت اپنی رنگت اور جسامت کو مدنظر رکھیں تاکہ درست لباس کا انتخاب کر سکیں۔ سادہ پرنٹ سوٹ سے لے کر حائی والے سوٹ چاہے 2 پیس ہوں یا 3 پیس یا پھر شرٹ کے پیس، دکانیں ان کی نئی کلیکشن سے بھری پڑی ہیں، ملازمت پیشہ خواتین لان کی شرٹس کے استعمال کو ترجیح دیتی ہیں جبکہ 2 پیس اور 3 پیس سوٹ کسی پارٹی یا پھر خاص مواقع پر پہننا پسند کرتی ہیں، عام طور پر گھریلو خواتین لان کے سادہ سوٹ پہننے کو ترجیح دیتی ہیں کیونکہ انہیں عموماً گھریلو کام کاج انجام دینے ہوتے ہیں۔ ایک جیسے لان کے کپڑے کی قمیص اور شلوار یا پینٹ، ٹراوزر وغیرہ کو زیادہ پسند کیا جا رہا ہے، تاہم لان کی شرٹ کے ساتھ بہتر کنٹراس کا حامل بوٹم پہنیں تو آپ کی شخصیت زیادہ جچے گی۔ اس کے ساتھ ہی پرانے فینسی کپڑوں کو ضائع کرنے کے بجائے ان کو گلے، بازو اور دامن پر لگا کر نیا ڈیزائن تیار کر سکتی ہیں جو دیکھنے میں انتہائی دلکش ہوتا ہے، ان بچے ہوئے کپڑوں سے بچوں کے خوشنما فراکس بھی سلوا سکتی ہیں، پرانی جیولری اور بٹن کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے لباس کو دلکش اور خوشنما لُک دے سکتی ہیں۔ آج کل قمیص کا اگلا اور پچھلا حصہ مختلف رنگوں کا ہوتا ہے، یہ فیشن مقبول ہو رہا ہے، پیچز کے نام پر قمیص پر مختلف رنگوں کے ٹکڑے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ لباس دیکھنے والوں کو متوجہ کرتے ہیں۔

مشرق
کہانی میگزین

انتخاب ساجد خان
گرافکس خرم شہزاد

ایمان کامران

فیشن کا نیا ٹرینڈ ''گرمی کے موسم میں لان کی بہار''

فیشن کا نیا ٹرینڈ ''گرمی کے موسم میں لان کی بہار'' کا ہے،خواتین کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں، انہیں تو بس لان کا جوڑا ہی گرمی کے موسم میں آسودگی بخشتا ہے۔مہنگائی کے اس دور میں بھی سستی سے سستی اور مہنگی سے مہنگی یعنی ہر کوالٹی کی لان مارکیٹ میں دستیاب ہے، پتیوں، بوٹیوں، پھولوں، پھلوں، تتلیوں اور دیگر دلکش ڈیجیٹل پیٹرن کی حامل لان نے خواتین کی بھرپور توجہ حاصل کر رکھی ہے۔خواتین گرمی کے موسم میں لان اور کاٹن کا انتخاب کرتی ہیں لہٰذا موسم کی مناسبت سے وہ خاص مواقع پر بھی بھاری کامدار ملبوسات کے بجائے پرنٹڈ شرٹس کو ترجیح دے رہی ہیں۔ ملک کے تمام معروف فیشن ڈیزائنرز اسٹائلش طرز کی شارٹ فراک تیار کر رہے ہیں جن پر ڈیجیٹل پرنٹ کے ساتھ ہلکی کڑھائی بھی موجود ہے جنہیں چپلم، ٹیولپ اور پینسل ٹراؤزر کے ساتھ پہنا جا رہا ہے، اہم یہ ہے کہ ایسے ملبوسات خریدتے وقت اپنی رنگت اور جسامت کو مدنظر رکھیں تاکہ درست لباس کا انتخاب کر سکیں۔سادہ پرنٹ سوٹ سے لے کڑھائی والے سوٹ چاہے 2 پیس ہوں یا 3 پیس یا پھر شرٹ کے پیس، دکانیں ان کی نئی کلیکشن سے بھری پڑی ہیں، ملازمت پیشہ خواتین لان کی شرٹس کے استعمال کو ترجیح دیتی ہیں جبکہ 2 پیس اور 3 پیس سوٹ کسی پارٹی یا پھر خاص مواقع پر پہننا پسند کرتی ہیں، عام طور پر گھریلو خواتین لان کے سادہ سوٹ پہننے کو ترجیح دیتی ہیں کیونکہ انہیں عموماً گھریلو کام کاج انجام دینے ہوتے ہیں۔ایک جیسے لان کے کپڑے کی قمیص اور شلوار یا پینٹ، ٹراؤزر وغیرہ کو زیادہ پسند کیا جا رہا ہے، تاہم لان کی شرٹ کے ساتھ بہتر کنٹراس کا حامل بوٹم پہنیں تو آپ کی شخصیت زیادہ جچے گی۔ اس کے ساتھ ہی پرانے فینسی کپڑوں کو ضائع کرنے کے بجائے ان کو گلے، بازو اور دامن پر لگا کر نیا ڈیزائن تیار کر سکتی ہیں جو دیکھنے میں انتہائی دلکش ہوتا ہے، ان بچے ہوئے کپڑوں سے بچوں کے خوشنما فراکس بھی سلوا سکتی ہیں، پرانی جیولری اور بٹن کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے لباس کو دلکش اور خوشنما لُک دے سکتی ہیں۔آج کل قمیص کا اگلا اور پچھلا حصہ مختلف رنگوں کا ہوتا ہے، یہ فیشن مقبول ہو رہا ہے، پیچ کے نام پر قمیص پر مختلف رنگوں کے ٹکڑے لگائے جا رہے ہیں۔یہ لباس دیکھنے والوں کو متوجہ کرتے ہیں۔

کائنات ہم میں ہے

تحریر: سلمان حبیب

قسط نمبر۔(7)

سو سال پرانی کہانی، جس میں پراسرار عمارت میں احمد صلاغی اپنی نوجوان پوتی اور خوبصورت شریر پوتے کے ساتھ آیا اور اس نے عمارت کے تمام دروازے بند کرائے۔ ایک ٹریفک حادثے میں اس کا بیٹا اور بہو ہلاک ہوگئے، پوتی اور پوتے کی ذمے داری احمد صلاغی پر آپڑی تھی۔

(گذشتہ قسط کا آخری پیراگراف)

اس نے ریحان کی جانب اشارہ کیا جو اس وقت بھی فضاء میں معلق تھا اور آہستہ آہستہ دنیا کے قریب اتر رہا تھا، آخرکار وہ دانیال کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''وہ یقیناً جادوگر ہے، یہ سائنسی عمل نہیں ہے، جادو ہے جادو... پیری ہذیانی انداز میں بولی۔

'بکواس.. جادو وادو سب بکواس باتیں ہیں آج کے دور میں ہر انہونی بات کی سائنسی توجیہہ موجود ہے۔''

''تو پھر اس کی سائنسی توجیہہ کرو یہ سب کچھ کیا ہے؟''

پیری نے ڈاکٹر رچرڈ لیموس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا، لیکن ڈاکٹر رچرڈ لیموس خود دنگ تھا، پھر اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''میں سمجھ رہا ہوں بہت سی صورت حال سمجھ رہا ہوں، یہ سب کچھ ایسی طاقت اور توانائی کا کمال ہے جس نے کشش ثقل کے قانون کو توڑ دیا ہے۔''

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو رچرڈ لیموس میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا'' پیری نے کہا۔

''لیکن یہ سب کچھ جو میں کہہ رہا ہوں سمجھ بھی رہا ہوں، آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہوں، یہ لڑکا اوہ میرے خدا میرے خدا... یہ لڑکا مولی کیولس ریگولیشن کو حرکت میں لے آیا ہے اوہ میرے خدا... مولی کیولس ریگولیشن کا یہ استعمال ناقابل فہم ہے'' لیموس نے اپنی ہتھیلی پر ہاتھ مارا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوتی جارہی تھی، خوفناک ارادوں کی چمک، اس کے منہ سے سانپ جیسی پھنکار ابھری۔

(آگے پڑھیے)

''میں ہر قیمت پر اس لڑکے کو پکڑوں گا، سنا میڈم پیری، میں ہر قیمت پر اس لڑکے کو پکڑ لوں گا۔ پکڑ لوں گا اس کو۔''

پیری کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہوچکی تھیں، لیکن جب اس نے رچرڈ لیموس کو دبے پاؤں اس لڑکے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

نجانے رچرڈ لیموس کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے، البتہ پیری کو ایک اطمینان ضرور تھا کہ اس کا پارٹنر ایک زبردست سائنسی ذہن کا مالک ہے، اگر وہ اس لڑکے کو پکڑنے کے بارے میں سوچ رہا ہے تو ٹھیک ہی سوچ رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خاموشی سے رچرڈ لیموس کے پیچھے چل پڑی۔

نوعمر لڑکا ریحان صلاغی اس وقت دانیال کو تسلی دے رہا تھا اس کے چہرے پر اپنی اس کامیابی پر کسی خوشی کے آثار نہیں تھے، مگر قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ فوراً پلٹا، رچرڈ لیموس پورے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف بڑھا

''واو... بہت شاندار زبردست...''

وہ دور ہی سے چیخا، لیکن نوجوان اس کی باتوں میں نہ آیا اور کسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اس نے دانیال کا ہاتھ پکڑا اور ایک دم فضا میں بلند ہوگیا، پیری نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''ویری گڈ.. ویری گڈ.. ویری گڈ.. یہ تم خوب کررہے ہو نوجوان، یہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔

پتہ نہیں ریحان نے اس کے یہ الفاظ سنے یا نہیں وہ زمین سے پندرہ فٹ کی بلندی پر معلق تھا، جب اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں سے کوئی اس کی جانب کسی غلط ارادے سے نہیں بڑھا تو آہستہ آہستہ زمین پر واپس آگیا، پیری پھر بے اختیار انداز میں بولی۔

''غضب کے انسان ہو تم شاید جادوگر یا شاید کسی بہت بڑے سائنسدان کے بیٹے کیا تم مجھ سے تعارف حاصل کرنا پسند کروگے، میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر پیری چند قدم آگے بڑھی، لیکن نوجوان واقعی چھوٹی عمر کا ہونے کی وجہ سے اتنا عقل مند نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اسی لمحے ایک تیز دھار پن اس کے بازو میں چبھی اور وہ ایک سسکاری لے کر رہ گیا، اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو رچرڈ لیموس اس کے بالکل قریب تھا اور شاید پن کا کارنامہ اسی نے سرانجام دیا تھا۔

ریحان کی آنکھیں ایک لمحے سے زیادہ کھلی نہ رہ سکیں نہ وہ یہ سمجھ سکا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے، وہ زمین پر گر پڑا اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے رچرڈ لیموس کے ہونٹوں پر خوفناک مسکراہٹ پھیل گئی، اس کے ہاتھ میں موجود خالی سرنج بتا رہی تھی کہ اس کا سیال وہ نوجوان لڑکے کے بازو میں اتار چکا ہے۔

تھوڑے ہی فاصلے پر موجود زریجہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے بھائی کے ساتھ کوئی گڑبڑ پیش آگئی ہے، اس نے فوراً ہی ریحان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہنی ریڈار اسکرین پر مکمل اندھیرا تھا اور ذہنی اسکرین پر تاریکی کا مطلب انتہائی خوفناک تھا، وہ ٹیکسی کی سیٹ پر پہلو بدل کر رہ گئی، اب وہ پہلے سے زیادہ طاقتور لہریں ریحان کے دماغ کو بھیج رہی تھی، اس مرتبہ ذہن کے ریڈار پر ایک ننھا سا بلب چمکنے لگا جو کبھی بجھ جاتا اور کبھی جل جاتا، اندھیرے ذہن میں بلب کا جلنا بجھنا اس بات کی علامت تھا کہ اس وقت اس کے بھائی کی زندگی انتہائی خطرے میں تھی۔

''ریحان... ریحان، کیا ہوا جواب دو، تم کیا محسوس کررہے ہو، مجھے بتاؤ۔''

لیکن اس کے مسلسل پکارنے پر بھی ریحان کے ذہن نے کوئی جواب نہیں دیا تو زریجہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، اسے یقین ہوگیا کہ ریحان شدید خطرے میں پھنس گیا ہے اور اسے فوراً مدد کی ضرورت ہے۔ وہ ہر بات سے بے نیاز ہوکر ٹیکسی سے باہر نکلی اور اسی سمت دوڑتی چلی گئی جس سمت میں یہ سنگین واقعہ پیش آیا تھا، لیکن وہ حادثے کی جگہ پر پانچ سیکنڈ دیر سے پہنچی تھی۔

مطلوبہ جگہ وہ اپنے بھائی کو نہ پا کر ایک بار پھر بدحواس ہوکر دوڑنے لگی۔ اس زیرتعمیر عمارت کے پاس اس نے ایک چکر لگایا، لیکن اب اس کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ ہونڈا سوک جو چند سیکنڈ پہلے ہی عمارت کے کارنر سے مڑ کر گئی ہے کہاں گئی ہے، اور اس کے بے ہوش بھائی کو کہاں لے جایا جارہا ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس نے اپنے بھائی کو کھو دیا ہے، وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی ٹیکسی کی طرف واپس پلٹ پڑی، لیکن دوسری پریشانی اس کی منتظر تھی کیونکہ ٹیکسی کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا، اصل میں ٹیکسی ڈرائیور یہ سمجھا تھا کہ دونوں بچے اس کا کرایہ مارنے کا پروگرام بنا کر چلتے بنے ہیں اور اب ظاہر ہے وہاں واپس نہیں آئیں گے، چنانچہ وہ ٹیکسی اسٹارٹ کرکے واپس چلا گیا۔

کافی دیر تک زریجہ سنسان سڑک پر بت بنی کھڑی رہی اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ بھائی کو پورے شہر میں تلاش کرے گی۔ لیکن دوپہر تک اسے ریحان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا، ذہنی رابطے کی کوشش میں بھی مسلسل ناکامی ہورہی تھی، اس اجنبی شہر میں وہ خدا جانے کہاں سے کہاں نکل آئی تھی۔ اسے پیدل چلتے چلتے تین گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ پھر اس نے اپنی جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھا وہ ایک گودی کے پاس نکل آئی تھی اور اس جگہ سے کافی دور ہوگئی تھی جہاں اس نے اپنے بھائی کو آخری مرتبہ دیکھا تھا، وہ بری طرح تھک گئی تھی اور اب اس کی آنکھیں آنسو بہانے کے لئے بری طرح بے چین تھیں۔

''اب میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟''

آخرکار مایوسی اور تنہائی کے احساس کے ساتھ ہی آنسو اس کے شفاف رخساروں کو بھگونے لگے، پھر اس سے پہلے کہ وہ روکر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکتی اس کے ذہن نے اسے خطرے کا سگنل دیا، یہ خطرہ گودی ہی کے کسی حصے سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا، چند لمحوں تک تو وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ یہ خطرہ کس قسم کا ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ خطرے کے سگنل کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل الارم دے رہا تھا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے، بھاگ جاؤ یہاں سے یا فوراً کسی جگہ چھپ جاؤ دشمن تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس مرتبہ اس کے دماغ نے واضح سگنل دیا تھا، تب اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، وہ تعداد میں چار تھے جو یقیناً نوجوان ہی تھے، شاید وہ ایک خوبصورت لڑکی کو تنہا دیکھ کر سیدھا اس کی طرف بڑھے آرہے تھے، زریجہ فوراً ہی رونا دھونا بھول گئی۔

چاروں شکل ہی سے بدمعاش نظر آرہے تھے، ان کے لباس بھی انہیں آوارہ ثابت کررہے تھے۔ آخرکار وہ زریجہ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے اس کے گرد اس طرح گھیرا ڈال دیا گویا کسی بھی لمحے زریجہ کو دبوچ لیں گے، زریجہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آوارہ لڑکوں سے کس طرح جان چھڑائے۔

وہ مسلسل پیچھے ہٹ رہی تھی۔ پھر وہ تیز تیز چلنے لگی۔ وہ چاروں مسلسل چند قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑے تھے، وہ زریجہ کو اس جگہ بھی پکڑ سکتے تھے جہاں انہوں نے اسے دیکھا تھا لیکن پتہ نہیں کیا ہوا تھا، شاید زریجہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے پناہ معصومیت اور حسن نے ان کو مرعوب کردیا تھا، شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس سے مرعوب ہوکر وہ غلطی کررہے تھے کیونکہ ان کی آنکھوں میں شیطانیت پھیلتی جارہی تھی۔ لیکن اب زریجہ جس سمت جارہی تھی وہاں ان کو اس سے بھی بہتر موقع مل سکتا تھا۔ زریجہ ان کی خوفناک سوچوں اور ارادوں سے آگاہ ہوتے ہی اس سے ڈر کر بھاگنے لگی۔

تیز... بہت تیز...

لیکن انہوں نے بھی اپنی رفتار تیز کردی تھی۔ ایک انجانے سے خوف نے گویا زریجہ کی ٹانگوں میں بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ وہ پہلے سے بھی تیز دوڑنے لگی اور نوجوان لڑکے بھی اس کے پیچھے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگے، لیکن اب وہ پیچھے ہوتے چلے جارہے تھے۔ دو تو کافی پیچھے رہ گئے لیکن باقی دو اس وقت بھی سائے کی طرح زریجہ کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے زریجہ ایک وسیع عمارت کے اندر پناہ لینے کے لئے داخل ہوگئی، لیکن اندر آتے ہی اسے یقین آگیا کہ اب اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا، وہ اس وقت گودام نما شیڈ کے اندر تھی، جہاں لاتعداد کارٹن اور بھری ہوئی بوریاں قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں، لیکن زریجہ آخری لمحے تک جدوجہد کرنا چاہتی تھی، وہ چھپنے کے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے لگی کہ اسی وقت وہ چاروں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

زریجہ کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس کے درمیان ٹھوس اینٹوں کی دیوار حائل تھی اور پیچھے وہ چاروں لڑکے اپنے شیطانی ارادوں کے ساتھ اسے گھیرے میں لے رہے تھے۔

(جاری ہے)

شام کے سائے تلے

تحریر: بسمیٰ راحت

(قسط نمبر 93)

.....گذشتہ قسط کا آخری پیراگراف)

یہ منظر اسے بہت اچھا لگ رہا تھا قریب ہی رکھی ہوئی ایش ٹرے میں اس نے چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑا تو چٹکی کی آواز پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی، خالد اس آواز پر چونک پڑا تھا، اس نے دوبارہ چٹکی بجائی تو اس بار بھی آواز کسی پٹاخے ہی کی طرح ابھری تھی۔ دفعتہً ہی اس کی گردن گھوم گئی، دروازے پر اختر کھڑا ہوا تھا، خالد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یہ حرکتیں میرے ساتھ بھی شروع کر دیں تم نے۔“ خالد نے کرسی گھمائی تو کرسی کے پایوں کی رگڑ اس طرح محسوس ہوئی جیسے توپیں گرج رہی ہوں۔ واقعی اختر اس سلسلے میں کمال رکھتا تھا انسانی آواز سے کئی گنا بڑی آوازیں نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، خالد ہنسنے لگا۔

”کیا بات ہے انتہاء پسندی کے موڈ میں ہو؟“

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، منطق کی رو سے۔“ اختر نے جواب دیا۔

”اے منطقی مگھس خیریت تو ہے کس لئے تشریف آئی ہے یہاں پر۔“ ”بس کچھ گفتگو کرنی تھی، دراصل بھائی جان آپ کو معلوم ہے کہ میں متحرک انسان ہوں اور مجھے سست رفتاری بالکل ناپسند ہے۔“

”مطلب..ترجمہ بھی کرتے چلے جاؤ۔“ خالد نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

(آگے پڑھیے)

”مطلب یہ کہ آپ کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو، ابھی تک تو آپ کی کتاب بند ہے اور پھر ڈیڈی نے یہ ذمے داری مجھ پر عائد کی تھی کہ آپ کا خیال رکھوں اور آپ کے نظریات کا جائزہ لیتا رہوں، چنانچہ منطق کی رو سے۔“

”بس بس اے منطقی بھائی تو میرا خیال رکھ رہا ہے یا نہیں۔“

”رکھ رہا ہوں، جب ہی تو تشویش کا شکار ہوں۔“ اختر نے کہا۔

”ترجمہ ترجمہ پلیز، اپنی اس پراسرار گفتگو کا ترجمہ کرتے رہا کرو۔“ خالد مسکرا کر بولا۔

”بھابھی بیگم ابھی تک آپ سے بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں اور مجھے اس دوران اس فاصلے میں ایک میٹر کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔“

”تمہارا کیا خیال یہ میں اس سے چپک جاؤں۔“ خالد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اختر نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

”بب..بھائی جان، مجھ سے ایسی گفتگو نہ کیا کریں۔“

”او..بھائی..میرا مطلب میرا مطلب، کیا بکواس کر رہا ہے میرا مطلب یہ تو نہیں تھا، چپک جانے سے مراد یہی تھی کہ اگر وہ مجھ سے دور رہرتی ہے تو پھر میں کیا کروں۔؟“ خالد نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں بھائی جان، پہلی بات تو یہ کہ آپ نے اپنی رائے کا کسی حد تک اظہار کر دیا ہے مجھ پر، یعنی یہ کہ لڑکی آپ کو ناپسند نہیں ہے، اگر وہ آپ کو پسند ہے تو پھر آپ یہ بائیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیوں نہیں کرتے، آگے بڑھیے، مردمیدان کی حیثیت سے آگے بڑھیے، اور منطق کی رو سے بھابھی بیگم کے قریب پہنچ جایئے۔“

”بھائی مجھ میں یہ صلاحیتیں نہیں ہیں بس ثناء کے بارے میں اگر میری رائے پوچھی جائے تو میں نہایت اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے اور ڈیڈی اگر اسے میری زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس بات کی خوشی ہوگی۔“

”زندہ باد، یہ بات کہی ہے آپ نے بھائیوں والی منطق کی رو سے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے“

”کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا اختر تم خود بتاؤ میری طبیعت میں تم نے چھچھورا پن کہاں سے پایا، اگر ڈیڈی میرا رشتہ احسان صاحب کی بیٹی ثناء سے کرنا چاہتے ہیں تو کیا اس کے لئے ضروری ہے کہ میں کسی فلمی ہیرو کی مانند وقت سے پہلے ثناء کے قریب پہنچ جاؤں اس سے اظہار عشق کروں، اس کے ساتھ درختوں اور کھیتوں میں چھلانگیں لگاتا پھروں فلمی گانے گاؤں اور پھر اپنی محبت کا اعلان کر دوں تم بتاؤ، کیا ان تمام باتوں کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق ہے، مجھے یہاں بھیج کر ثناء کے بارے میں میری رائے پوچھی گئی اور میں نے اس رائے کا اظہار تم پر کر دیا، تم اگر چاہو تو ڈیڈی کو میرے رائے کے بارے میں بتا دو، باقی اس سے زیادہ میں کچھ کرنے کا قائل نہیں ہوں، ثناء کی مرضی بھی اس میں شامل ہوگی، ممکن ہے وہ اس حیثیت سے مجھے قبول کرنا پسند نہ کرے اور میرے محترم چھوٹے بھائی اگر ثناء نے اس سلسلے میں انکار کر دیا تو تم یقین کرو کہ میں ایک دن بھی شیو بنانے کا نافہ نہیں کروں گا اور نہ ہی کوئی درد بھرا شعر گنگنانے کی کوشش کروں گا یہ میرا وعدہ ہے۔“

”یا کمال ہے بھائی جان، ایسے خشک قسم کے دولہا دلہن میں نے کبھی نہیں دیکھے۔“ خالد نے ہنستے ہوئے کہا۔

تو پھر اب دیکھ لو میں کوئی فضول حرکت کبھی نہیں کروں گا، ہاں اگر ثناء کبھی میری طرف متوجہ ہوئی یا یہ بات اس کے کانوں تک پہنچی اور اس نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو میں اس سے گفتگو ضرور کروں گا، ویسے مجموعی طور پر مجھے وہ لڑکی پسند ہے، کیونکہ اس دوران اس نے نہ ہی کبھی میری طرف مسکرا کر دیکھا نہ اس کی آنکھوں میں حجاب پیدا ہوا، بالکل دوستوں کی طرح یا شاساؤں کی طرح مجھ سے ملتی ہے، سلام دعا کی حد تک بات رہتی ہے اور اس سے زیادہ وہ باتیں کر بھی کیا سکتی ہے۔“

”کمال ہے بھائی جان، میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں، جب آپ کو زندگی کے ان راستوں پر قدم بڑھانا ہے تو پھر ثناء سے مل کر اس کی ذاتی رائے بھی دریافت کریں اس کے معمولات اس کی پسند اس کا شوق۔“

”نہیں بھائی اللہ کے واسطے مجھے اس امتحان سے دور رکھو، میرا ٹائپ یہ نہیں ہے۔ میرے لئے بس یہی کافی ہے کہ ثناء ایک سادہ سی لڑکی ہے، خوش مزاج ہے، پر مذاق ہے، شرارتیں کرتی ہے، اور یہ ساری باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں لیکن میں خود نہ ان شرارتوں میں شامل ہو سکتا ہوں نہ اسے لطیفے سنا سکتا ہوں، نہ اسے ساتھ لے کر کہیں چہل قدمی یا لانگ جمپ یا ہائی جمپ کے مظاہرے کر سکتا ہوں، بس ٹھیک ہے اگر سب لوگوں نے منظور کیا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”منطق کی رو سے۔“ اختر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ویسے یار اختر ایک بات اور میرے ذہن میں آئی ہے۔“

”کیا ارشاد ارشاد؟“ اختر نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں کچھ اور بھی نظر آ رہا ہے مجھے، اگر ہم دونوں بھائی ہی اس عمارت سے منسلک ہو جائیں تو کیا ہرج ہے؟“

”سمجھ رہا ہوں بھائی جان، یہ جوابی کاروائی ہے، کر لیں کر لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی لڑکیوں کی باتیں کرتے ہوئے مجھے کوئی شرم آتی ہے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اچھا لگتا ہے آپ کے ذہن میں اگر کچھ ہے تو بتائیں۔“

”ابھی تک تو کچھ نہیں، لیکن یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم ان لوگوں میں خاصے گھلتے ملتے جا رہے ہو۔“ خالد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”کوشش کر رہا ہوں بھائی جان لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری خواتین اپنے آپ کو لئے دیئے رکھنے کی عادی ہیں، ویسے یہ دلچسپ بات ہے کہ اس گھر میں ہمارا مدمقابل کوئی نہیں ہے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پہلے سے کوئی سائیڈ ہیرو یہاں موجود نہیں ہے جو کوئی رکاوٹ ڈالے، آپ سمجھتے ہیں نا یہ سائیڈ ہیرو ٹائپ کی چیزیں اکثر ان اطراف میں موجود ہوتی ہیں، جیسے فلموں میں ہوتا ہے، لیکن یہاں کوئی سائیڈ ہیرو نہیں ہے، ایک اپنے وہ رشید بھائی ہیں کوئے والے، مگران کی مونچھوں کی نوکیں اتنی زبردست ہیں کہ خواتین کی نگاہ میں چبھ کر رہ جاتی ہیں، چنانچہ ان سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہے، باقی اور کون ہے۔؟“

”ہوں ہوں گویا تمہیں یہاں کسی رقیب روسیاہ کا سامنا نہیں ہے۔“

”معاف کیجئے گا بھائی جان، گستاخی نہ تصور کریں اب دوستی کی ہے تو اسے نباہ بھی دیں، دراصل یہاں کوئی ہیروئن ہی نہیں ہے جو رقابت کا مادہ ہو۔“

”ہوں بہرطور تمہاری تو خوب گزر رہی ہے“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کچھ لوگوں سے واقعی اچھی چلے گی، لیکن ابھی دشمن مقابلے پر نہیں آیا ہے۔“

”مطلب..؟“

”مطلب منطق کی رو سے بتایا نہیں جا سکتا۔“ اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کوئی گڑبڑ نہیں کرنا، میرا معاملہ کھٹائی میں نہیں پڑنا چاہیے۔“

”مٹھائی ہی مٹھائی ہوگی، آپ فکر نہ کریں، بس اختر زندہ باد کے نعرے لگاتے رہا کریں، ویسے بھائی جان، اب میں سنجیدہ ہوں، واقعی آپ کو ثناء کی قربت حاصل کرنی چاہیے، کم از کم سادہ لوحی سے ہی سہی، آپ کو اور انہیں ایک دوسرے کی طرف متوجہ تو ہونا ہی چاہیے، یہ کیا کہ ثناء کے دل میں ابھی تک آپ کا کوئی تصور ہی بیدار نہ ہوا ہو۔“

”اختر پلیز، تو یقین کر مجھے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”تو پھر اختر کو چنگ سینٹر میں داخل ہو جایئے، ہم آپ کو تربیت دیں گے۔“

”داخلہ فیس کیا ہوگی؟“ خالد نے سوال کیا۔

”پہلے فارم حاصل کر لیجئے، اس پر تمام کوائف درج ہوں گے۔“ اختر بھی مسکرا کر بولا اور خالد ہنسنے لگا۔

”اور کوئی کام تو نہیں ہے مجھ سے۔“

”جی نہیں، بس یہی پوچھنا تھا، ویسے آپ کو آج ہی سے آغاز کر لینا چاہیے بھابھی بیگم کی قربت حاصل کرنے کا۔“

”بتا دو بھائی وہ کیسے؟“

”آج شام کی چائے پر آپ انہیں پائیں باغ میں ٹہلنے کی عوت دیجئے، کوشش کر کے دیکھ لیجئے کیا ہرج ہے، میرا خیال ہے تھوڑی بہت گفتگو بھی ہو جائے، لیکن یہ آپ کی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ بھابھی بیگم اس کے لئے آمادہ ہو جائیں، ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ بہت زیادہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں ہیں، صرف وہ ایک ندرت ہے جو اللہ رکھی کے نام سے پکاری جاتی ہے یا وہ ایک میڈم مونالیزا ہیں جن کی مسکراہٹ واقعی مونالیزا کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ حسین ہے، وہ جو ایک بچے کی ماں ہیں اور جن کا بچہ بھابھی بیگم نے گود لے رکھا ہے۔“

”روا کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں ویسے بڑی پاکیزہ فطرت کی مالک لڑکی ہے، آپ یقین کیجئے مجھے اس سے پیار ہے، ثناء نے کہا تھا کہ وہ گونگی ہے، لیکن اس کا گونگا پن میں نے ختم کر دیا اور وہ مجھے بھائی کہنے لگی ہے“

”گڈ گڈ اس کا مقصد ہے کہ تم یہاں خاصے تعلقات پیدا کرتے جا رہے ہو۔“

”اب آپ کے لئے تو پتہ نہیں کیا کیا کچھ کرنا ہوگا، بہرحال بھائی جان، آپ میری ہدایت پر عمل کیجئے، آج شام کی چائے کے بعد بھابھی بیگم کو چہل قدمی کی دعوت اور پھر یہ چہل قدمی کوٹھی کے باہر تک ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے اور اس کے بعد کسی خوبصورت سے علاقے میں جس کی تلاش میں کر دوں گا آپ بالکل فکر نہ کریں، ویسے میرا خیال ہے سمندر کے کنارے آپ کو یہ کاروائی کرنی تھی، لیکن خیر کوئی بات نہیں نہ سمندر دور ہے اور نہ بھابھی بیگم۔“

(جاری ہے)

تفسیر شہاب کا جگری دوست تھا، اگر اسے اسٹیشن پر رسیو نہ کیا جاتا تو بگڑ جاتا، اس لئے نجانے کتنے عرصے کے بعد شہاب نے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تھا۔ سیاہ چادر گیٹ سے نکلی، ٹکٹ چیکر جگہ چھوڑ چکا تھا اس لئے گیٹ خالی پڑا تھا

ریٹنگ کی دوڑ نے صحافت کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا

نئے آنے والوں کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہوگا

صبر، جستجو، محنت اور لگن کامیابی کی ضامن ہے۔ سینئر صحافی، اینکر پرسن فرخ شہباز وڑائچ

انٹرویو پینل: مہر علی، لائبہ اظہر

آج کا انٹرویو خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں صحافت کے مختلف پہلوؤں پر بات کی گئی ہے۔ صحافت کسی بھی معاشرے کی ساخت کا لازمی جز ہے اور اس کے کردار کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں آج ہم نے بات کی پاکستان کے معروف کالم نگار، جرنلسٹ، اینکر پرسن اور پوڈ کاسٹر فرخ شہباز وڑائچ سے۔ انہوں نے اپنے صحافتی سفر، پیش آنے والی مشکلات، حقائق کی پاسداری، پیشہ ورانہ تجربات اور دیگر اہم موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

لائبہ اظہر: اپنے ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں اور اپ کو صحافت اختیار کرنے کی ترغیب کیسے ملی؟

فرخ شہباز وڑائچ: : بنیادی طور پہ میرا لکھنے لکھانے سے شوق پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی سے میں نے اخبارات اور رسائل پڑھنے شروع کر دیے ادھر سے مجھے صحافت میں آنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور یہی میرا شوق مجھے صحافت کی طرف لے کر ایا۔

س: آپ نے بطور صحافی لکھنے کا اغاز کب شروع کیا؟

جواب: 2005 سے چھ کے درمیان میں نے بطور صحافی لکھنا شروع کیا۔ اور 2012 سے 13 میں میں نے مکمل طور پر بطور صحافی کے طور پے لکھائی کی طرف آ گیا۔ اور ساتھ ساتھ میں پڑھائی بھی کر رہا تھا اور ایک ادارے میں کام بھی کر رہا تھا۔

س: آپ کی تعلیم نے صحافت کے میدان میں آپ کی کس طرح رہنمائی کی؟

جواب: ماحول انسان پہ برا اثر انداز ہوتا ہے۔ میں اس طرح کے ماحول میں رہتا تھا جو لوگ میڈیا میں کام کرتے تھے اور ان کو دیکھ کر میں انسپائر ہوتا تھا متعلقہ شعبے کے لوگوں کو دیکھ کر میں نے اس شعبے میں آنے کا سوچا اور اپنا کام شروع کیا۔ بہت سے میڈیا کے لوگ آتے تھے ان کو دیکھ کر انسپائر ہوا اور اس فیلڈ میں انے کا ارادہ کیا۔

س: آپ نے کم عمری میں صحافت شروع کی ابتدا میں اپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

فرخ شہباز وڑائچ: ابتدا میں مجھے بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جیسے کہ لوگ آپ کو سیریس نہیں لیتے، اپ کی بات نہیں مانتے، وقت نہیں دیتے، مجھے پہچان بنانے میں بہت وقت درکار رہا۔ میرا خیال ہے سب سے مشکل مرحلہ میرا یہی تھا۔

لائبہ اظہر: آپ اپنے سیاسی کالمز کے لیے موضوعات کا انتخاب کیسے کرتے ہیں؟

جواب: ایسے موضوعات جو چل رہے ہوں۔ جیسا کہ کرنٹ افیئرز، کوئی ایسا لمحہ جہاں اپ کو لگے کہ غلط ہو رہا ہے اور اپ کو اپنی رائے دینی چاہیے۔ مثال کے طور پر اسمبلی توڑنے کی بات۔ منتخب حکومت کو گھر بھیجنے کی بات، جہاں اپ کو لگتا ہے کہ آپ کو اس بات میں اپنی رائے ضرور دینی چاہیے۔ میں خصوصی طور پر انہی موضوعات کا انتخاب کرتا ہوں۔

س: پی ٹی وی میں کام کرنے کے تجربے نے آپ کی پیشاورانہ صلاحیت کو کس طرح نکھارا؟

جواب: مجھے پتہ چلا کہ پی ٹی وی کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کی باؤنڈریز کیا ہیں۔ بہت سی چیزیں جو پرائیویٹ میڈیا پر نشر ہو جاتی ہیں وہ پی ٹی وی پر ممکن نہیں ہے۔ بہت سی نئی چیزیں پتہ چلی۔ گورنمنٹ کیسے کام کرتی ہے۔ گورنمنٹ سیکٹر میں کیا ہوتا ہے۔ اور گورنمنٹ کی پالیسی کیا ہوتی ہیں۔

س: آپ کے کالم زیادہ تر سیاسی اور سماجی موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں اپ ان موضوعات کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

جواب: میرا ملان اس طرف ہے میرا رجحان اس طرف ہے۔ اور میرا سبجیکٹ یہی ہے میں سیاست کا صحافت کا طالب علم ہوں۔ اور اسی لیے میں ان موضوعات کو ترجیح دیتا ہوں۔

س: آپ اپنی سیاسی تجزیہ نگاری میں درستگی اور اعتبار کو کیسے یقینی بناتے ہیں؟

فرخ شہباز وڑائچ: یہ بہت اہم ہے اور یہی مین چیز ہے۔ جو اپ تجزیہ دے رہے ہیں۔ جو انفارمیشن اپ لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ وہ درست ہوں اور حقائق پر مبنی ہوں۔ اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ جو بھی انفارمیشن لیتے ہیں۔ اس کا تعلق حقائق سے ہونا چاہیے۔

س: ایک مضبوط اور موثر کالم نگار کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں؟

جواب: زبان اچھی ہو، عام الفاظ میں بات کو بیان کیا گیا ہو۔ اور بتائی ہوئی معلومات درست ہو۔ تاکہ ہر پڑھنے والا شخص اس سے ریلیٹ کر سکے۔ یہی موثر کالم نگار کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

لائبہ اظہر: تحقیق (ریسرچ) صحافت میں کتنی اہمیت رکھتی ہیں؟

جواب: بہت زیادہ، تحقیق کیے بغیر کچھ ممکن نہیں۔ خاص طور پر صحافت میں۔ تحقیق اور صحافت ان دونوں کا بڑا ہی قریبی تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے۔ کیونکہ ہر خبر کے ساتھ تحقیق جڑی ہوتی ہے۔

لائبہ اظہر: پنجاب یونین اف جرنلسٹ کے صدر کی حیثیت سے اپ کی کیا ذمہ داریاں تھی؟

جواب: یہ ایک پلیٹ فارم ہے جو صحافی ہے ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے اواز اٹھانا، ان کی اواز کو آگے پہنچانا، اور ان کے مطالبات کے لیے جدوجہد کرنا۔ بحیثیت پنجاب یونین اف جرنلسٹ کے صدر کی حیثیت سے میری یہ کچھ ذمہ داریاں تھی۔

س: صحافی تنظیمیں پاکستان میں ازادی صحافت کو کیسے بہتر بنا سکتی ہیں؟

جواب: ازادی صحافت کے لیے جدوجہد کر کے، اس کے لیے شعور عام کر کے۔ معاشرے کو یہ بتا کر کہ صحافت ان کے لیے کتنی اہم ہے۔

س: اج کل پاکستان میں صحافت کو کن چیلنجز کا سامنا ہے؟

جواب: ایک تو صحافیوں کو تحفظ کا معاملہ ہے۔ صحافیوں کو وہ مارات نہیں ملتی، جو ان کے مستحق ہیں۔ تنخواہ باقاعدگی سے نہیں ملتی۔ اداروں میں استحصال ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر صحافیوں کو یہی چیلنجز کا سامنا ہے۔

س سوشل میڈیا نے پاکستان میں صحافت کو کس طرح تبدیل کیا؟

جواب: سوشل میڈیا کی وجہ سے تیزی ائی ہے خبر فوری طور پر نشر ہوتی ہے۔ جی سر کریڈیبلیٹی کا بھی ایشو ایا ہے۔ پہلے لوگ خبر ان کے تجسس میں اجاتے تھے کہ یہ صحیح بھی ہے یا غلط ہے۔ لیکن سوشل میڈیا کی وجہ سے اب واضح طور پر خبر میں پتہ چلتا ہے کہ یہ خبر سچی ہے یا جھوٹی۔ اور سوشل میڈیا کی وجہ سے صحافت انفرادی طور پر بھی ہو گئی ہے مثال کے طور پہ، لوگوں نے اپنے اپنے ولوگز وغیرہ کرنا شروع کر دیے ہیں۔

س ان طلبہ کو اپ کیا مشورہ دیں گے جو صحافی بننا چاہتے ہیں؟

جواب: یہ ایک لائف سٹائل ہے۔ یہ کوئی 9/5 جاب نہیں ہے۔ یہ ایک تجسس ہے۔ اس میں موضوعات کو مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس میں بہت سے چیلنجز اتے ہیں جن کا اپ کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پہ، اپ کو پرخطر علاقوں میں جانا پڑتا ہے۔ اپ کو اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔ اور خطرناک حالات سے نمٹنا پڑتا ہے۔ پھر ہی اپ ایک کامیاب صحافی بن سکتے ہیں۔

مہر علی: آپ نے صحافت کا آغاز کیسے کیا؟ شروع میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

جواب: شروع میں وہی ابتدائی مشکلات ہوتی ہیں۔ آپ کو جاب نہیں ملتی، انٹرن شپ کرنے میں مسائل آتے ہیں، لوگ ہمیں جانتے نہیں ہوتے۔ ہمیں انہیں بتانا اور منوانا پڑتا ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں یا کر سکتی ہوں۔

مہر علی: آپ سیاسی رپورٹنگ کی طرف کیسے آئے؟ کیا یہ آپ کا ذاتی انتخاب تھا؟

جواب: جی، یہ میرا ذاتی انتخاب تھا کیونکہ مجھے سیاسی رپورٹنگ اچھی لگتی تھی۔ سیاسی معاملات کے بارے میں جاننا، الیکشن کی تفصیلات اور حلقوں کی باتیں — یہی وجہ تھی جس نے مجھے سیاسی رپورٹنگ کی طرف کھینچا۔

مہر علی: کیا آپ مسلسل ایک ہی موضوع پر کام کرتے ہوئے بوریت محسوس کرتے ہیں؟

جواب: نہیں، مزہ آتا ہے۔ جو کام آپ کو اچھا لگتا ہو اور وہی آپ کا روزگار کا ذریعہ بھی بن جائے تو وہ مزید اچھا لگتا ہے۔ روز نئے موضوعات، نئے لوگ اور نئی چیزیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔

مہر علی: رپورٹنگ کے بعد اینکر پرسن بننے تک کا تجربہ کیسا رہا؟

جواب: بہت اچھا تجربہ تھا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو براہ راست اینکر بنتے ہیں، ان سے یہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ آپ کو فیلڈ میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب آپ اسٹوڈیو میں بیٹھ کر کوئی بات کر رہے ہوتے ہیں تو اس کا ایک بیک گراؤنڈ ہوتا ہے اور آپ کو سمجھ ہوتی ہے۔ کسی بھی خبر کو ویریفائی کرنا اس اینکر کے مقابلے میں، جو فیلڈ میں کام کیے بغیر آتا ہے، ہمارے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

مہر علی: کیا صحافتی کیریئر کے دوران کبھی ایسا واقعہ پیش آیا کہ آپ دل گرفتہ ہو کر صحافت چھوڑنے کا سوچیں؟

جواب: بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں جن میں دل گرفتہ ہونا پڑا، لیکن میں نے کبھی صحافت چھوڑنے کا نہیں سوچا کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں نے ساری زندگی یہی کام کرنا ہے۔ اس کا تعلق پیسوں سے نہیں بلکہ شوق سے ہے۔ سیاسی صحافت میں ایسے حالات آتے رہتے ہیں جہاں لوگوں کے رویے یا معاملات مناسب نہیں ہوتے، لیکن ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

مہر علی: رپورٹنگ سے اینکر پرسن اور پھر پوڈکاسٹ تک کا سفر کیسا رہا؟

جواب: بہت اچھا سفر رہا۔ پوڈکاسٹ ایک نیا فیز ہے۔ اس میں لوگ اپنی بات آسانی اور تہذیب سے کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ٹیلی ویژن کی طرح سخت پیرامیٹرز نہیں ہوتے، اس لیے یہ ایک اچھا تجربہ ہے۔ اس میں لوگوں کی کہانیاں سننے، سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور میں اسے انجوائے کر رہا ہوں۔

مہر علی: کیا کسی پوڈکاسٹ پر تنقید کا سامنا ہوا؟

جواب: بہت سی پوڈکاسٹس پر تنقید ہوئی۔ جب بھی آپ کوئی کام کرتے ہیں تو کسی نہ کسی گروپ کے خلاف کوئی بات ہو سکتی ہے، چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی۔ ایسے میں متاثرہ گروپ سوشل میڈیا پر آپ کے خلاف مہم چلاتا ہے۔ ہمیں بھی اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ہماری جاب کا حصہ ہے۔

مہر علی: کیا کبھی رپورٹنگ کے دوران دباؤ یا خطرہ محسوس ہوا؟ اس وقت آپ نے کیا کیا؟

جواب: جب بھی دباؤ یا خطرہ محسوس ہوا تو سینئرز سے بات کی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ایسی مشکلات میں کیا کرتے تھے اور وہاں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اسی طرح مینٹورز سے ڈسکشنز کے ذریعے رہنمائی ملی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

مہر علی: خبر دینے سے پہلے معلومات کو کیسے چیک کرتے ہیں؟

جواب: معلومات کو چیک کرنے کے لیے متعدد ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ جہاں سے خبر آئی ہے، وہاں سے تصدیق کی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایجنڈا تو نہیں یا ہمیں استعمال تو نہیں کیا جا رہا۔ انٹرنیٹ، کتابوں، تاریخ اور سیاست کے علم کی مدد لی جاتی ہے۔ (باقی صفحہ 15 پر)

برسوں کی محنت اور 93 ارب ڈالر کا خرچہ

آرٹیمس دوم زمین کے مدار میں، مگر چاند پر جانے کا یہ منصوبہ اتنا اہم کیوں ہے؟

اس 10 روزہ مشن کے دوران خلائی جہاز چاند پر نہیں اُترے گا، بلکہ اس کے گرد چکر لگانے کا منصوبہ ہے، اور ممکن ہے کہ یہ زمین سے اتنی دور جائیں جتنا کوئی انسان پہلے کبھی نہیں گیا۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے علاوہ دیگر عالمی رہنماؤں نے بھی ناسا کی ٹیم اور اس مشن میں شامل خلابازوں کو آرٹیمس دوم کی کامیاب لانچنگ پر مبارکباد دی ہے۔

.....میگزین رپورٹ.....

ناسا کا 'آرٹیمس دوم' مشن روانہ ہو چکا ہے اور فی الحال یہ خلائی جہاز اب زمین کے گرد مدار میں موجود ہے۔ یہ اگلے 24 گھنٹے تک مدار میں رہے گا تاکہ زمین پر موجود سائنسدان اور عملہ جانچ پڑتال کر سکے اور اگر سب چیزیں منصوبے کے مطابق اور ٹھیک رہیں تو اسے چاند کی طرف جانے کی اجازت مل جائے گی۔ ایک ناسا اہلکار نے اس مشن کے مدار میں پہنچنے کے بعد تصدیق کی کہ خلائی جہاز پر موجود عملہ 'محفوظ، پُراعتماد اور بہترین موڈ میں ہے۔' اس 10 روزہ مشن کے دوران خلائی جہاز چاند پر نہیں اُترے گا، بلکہ اس کے گرد چکر لگانے کا منصوبہ ہے، اور ممکن ہے کہ یہ زمین سے اتنی دور جائیں جتنا کوئی انسان پہلے کبھی نہیں گیا۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے علاوہ دیگر عالمی رہنماؤں نے بھی ناسا کی ٹیم اور اس مشن میں شامل خلابازوں کو آرٹیمس دوم کی کامیاب لانچنگ پر مبارکباد دی ہے۔ صدر ٹرمپ نے اس مشن کو 'بہت شاندار' قرار دیا اور کہا کہ یہ راکٹ اتنی دور جائے گا جتنا اس سے پہلے کوئی انسان بردار راکٹ نہیں گیا اور یہ 'بہت نمایاں طور پر چاند کو پیچھے چھوڑ دے گا۔' آج کے کامیاب لانچ کا مطلب یہ بھی ہے کہ خلاباز خلائی جہاز سے جزوی سورج گرہن بھی دیکھ سکیں گے۔ چاند سورج کو ڈھانپ رہا ہوگا، لیکن وہ سورج کے کورونا یعنی اس کے ماحول کے بیرونی حصے کو دیکھ سکیں گے۔ ناسا کی قائم مقام ایسوسی ایٹ منتظم ڈاکٹر لوری گلیزے نے ایک پریس کانفرنس میں صحافیوں کو بتایا کہ 'یہ ایک منفرد موقع ہوگا۔' ناسا نے آرٹیمس دوم مشن اپنے چار خلابازوں کے ہمراہ چاند کی جانب روانہ کیا ہے۔

آرٹیمس پروگرام سائنسدانوں کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے، اور اس کاوش میں ہزاروں افراد شامل رہے ہیں اور اب تک اس پر تقریباً 93 ارب ڈالر لاگت کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں میں یہ احساس نمایاں ہے کہ 'یہ پہلے ہو چکا ہے۔' 50 سال سے زیادہ عرصہ پہلے، امریکہ کے اپالو مشنز نے تاریخ رقم کی تھی جب پہلی بار انسانوں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ چاند پر مجموعی طور پر چھ کامیاب لینڈنگز کے بعد ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چاند کی تسخیر کو خلائی فہرست سے مکمل طور پر نکال دیا گیا ہے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ پھر امریکہ وہاں پہنچنے کے لیے دوبارہ اتنا وقت، محنت اور سرمایہ کیوں لگا رہا ہے؟

قیمتی وسائل

چاند کی سطح خشک، گرد آلود اور کچھ حد تک بنجر دکھائی دیتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ پروفیسر سارہ رسل نیچرل ہسٹری میوزیم میں سیاروں سے متعلق ماہر سائنسدان ہیں۔ وہ کہتی ہیں 'چاند میں وہی عناصر موجود ہیں جو زمین پر ہیں۔' 'ایک مثال نایاب زمینی عناصر کی ہے، جو زمین پر بہت کم پائے جاتے ہیں، اور ممکن ہے کہ چاند کے کچھ حصوں میں یہ اتنی مقدار میں موجود ہوں کہ مستقبل میں اُن کی کان کنی کی جا سکے۔' وہ مزید کہتی ہیں کہ 'وہاں دھاتیں بھی ہیں، جیسے لوہا اور ٹائٹینیم، اور ہیلیم بھی، جو سپر کنڈکٹرز سے لے کر طبی آلات تک ہر چیز میں استعمال ہوتی ہیں۔' 'لیکن سب سے حیران کُن اور سب سے زیادہ قیمتی چیز پانی ہے۔'

رسل کہتی ہیں کہ 'چاند کے کچھ معدنیات میں پانی موجود ہے، اور قطبین پر بھی پانی کی بڑی مقدار موجود ہے۔' وہ بتاتی ہیں کہ چاند پر کچھ گڑھے مستقل طور پر سائے میں رہتے ہیں، جہاں برف جمع ہو سکتی ہے۔

چاند پر رہنے کے لیے پانی تک رسائی انتہائی ضروری ہے۔ یہ نہ صرف پینے کے لیے ضروری ہے بلکہ اسے ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تقسیم کر کے خلابازوں کے لیے سانس لینے کے لیے درکار ہوا اور حتیٰ کہ خلائی جہازوں کے لیے ایندھن میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

خلا پر اجارہ داری کی دوڑ

امریکہ کے اپالو مشنز، جو 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں چاند پر گئے، سوویت یونین کے ساتھ خلائی برتری کی دوڑ سے متاثر ہو کر شروع کیے گئے تھے۔ تاہم اس بار مقابلہ چین ہے۔

چین اپنے خلائی پروگرام میں تیزی سے پیش رفت کر رہا ہے۔ اس نے کامیابی کے ساتھ روبوٹس اور روورز کو چاند پر اُتارا ہے اور چین کا دعویٰ ہے کہ وہ سنہ 2030 تک انسانوں کو چاند پر پہنچا دے گا۔

چاند کی دھول میں جھنڈا گاڑنا اب بھی وقار کی بات ہے لیکن اب یہ بھی اہم ہے کہ آپ اسے چاند کے کس مقام پر گاڑتے ہیں۔

امریکہ اور چین دونوں چاند کے اُن حصوں تک رسائی چاہتے ہیں جہاں وسائل سب سے زیادہ ہیں، جس کا مطلب ہے کہ چاند کی بہترین زمین پر دسترس حاصل کرنا۔ اقوام متحدہ کا سنہ 1967 کا آؤٹر سپیس کا معاہدہ کہتا ہے کہ کوئی بھی ملک چاند کا مالک نہیں بن سکتا۔ لیکن جب بات چاند پر موجود وسائل کی آتی ہے تو معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ پہلی برطانوی خلاباز ڈاکٹر ہیلن شارمن کہتی ہیں کہ 'اگرچہ آپ چاند کے کسی حصے کے مالک نہیں بن سکتے کیونکہ اقوام متحدہ کا معاہدہ اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن آپ کسی بھی حصے پر بلا روک ٹوک کام کر سکتے ہیں۔' 'تو اس وقت سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے حصے کی زمین حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ اس کے مالک نہیں بن سکتے، لیکن آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور ایک بار جب آپ وہاں پہنچ گئے، تو یہ آپ کے پاس اتنی دیر تک رہے گا جتنی دیر تک آپ چاہیں۔'

مریخ کی جانب راستہ ہموار کرنا

ناسا کی نظریں مریخ پر ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ 2030 کی دہائی تک انسانوں کو وہاں بھیجے۔

ٹیکنالوجی کی رکاوٹوں کو دیکھتے ہوئے یہ ایک مشکل ہدف لگتا ہے۔

لیکن کہیں سے تو آغاز کرنا ضروری ہے، اور امریکہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آغاز چاند سے کرے گا۔ سائنس میوزیم کی سپیس ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ لبی جیکسن کہتی ہیں 'چاند پر جانا اور وہاں طویل عرصے تک قیام کرنا کہیں زیادہ محفوظ، سستا اور آسان ہے تاکہ یہ سیکھا جا سکے کہ کسی دوسرے سیارے پر کیسے رہنا اور کام کرنا ہے۔' 'چاند کے بیس پر ناسا وہ ٹیکنالوجی بہتر بنا سکتا ہے جو خلابازوں کو ہوا اور پانی فراہم کرے۔ انھیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ توانائی کیسے پیدا کی جائے اور ایسے رہائشی ڈھانچے کیسے بنائے جائیں جو لوگوں کو شدید درجہ حرارت اور خطرناک خلائی تابکاری سے بچا سکیں۔

جیکسن کہتی ہیں کہ 'یہ سب ٹیکنالوجیز اگر آپ پہلی بار مریخ پر آزمائیں اور وہ ناکام ہو جائیں تو یہ ممکنہ طور پر تباہ کن ہوگا۔ انھیں پہلے چاند کی سطح پر آزمانا کہیں زیادہ محفوظ اور آسان ہے۔'

راز جو ابھی تک کے کھلنے باقی ہیں

اپالو خلابازوں نے اپنے مشنز کے دوران پتھروں کے نمونے جمع کیے جنھوں نے دنیا پر نئے راز آشکار کیے

سائنسدان بے صبری سے چاند سے لائے جانے والے نئے مواد کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے منتظر ہیں۔ اپالو خلابازوں کے لائے ہوئے پتھروں نے ہمارے اس فلکی پڑوسی کے بارے میں ہماری سمجھ بوجھ کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ پروفیسر سارہ رسل کہتی ہیں کہ 'انھوں نے ہمیں بتایا کہ چاند ایک نہایت ڈرامائی واقعے کے نتیجے میں بنا، جب مریخ کے سائز کا ایک حصہ زمین سے ٹکرایا تو اس کے ٹکڑوں سے چاند وجود میں آیا۔ ہمیں یہ سب اپالو کے پتھروں سے معلوم ہوا۔' لیکن وہ کہتی ہیں کہ ابھی بھی بہت کچھ دریافت ہونا باقی ہے۔

چونکہ چاند بھی زمین کا حصہ تھا، اس میں ہماری اپنی زمین کی 4.5 ارب سالہ تاریخ کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ اور چونکہ وہاں پلیٹ ٹیکٹونکس، ہوا یا بارش نہیں ہے جو اس ریکارڈ کو مٹا سکے، اس لیے چاند ایک بہترین ٹائم کیپسول ہے۔

رسل کہتی ہیں کہ 'چاند زمین کا شاندار آرکائیو ہے۔' انھیں امید ہے کہ 'چاند کے کسی مختلف علاقے سے پتھروں کا نیا ذخیرہ حاصل کرنا حیرت انگیز ہوگا۔'

نئی نسل کو متاثر کرنا

اپالو مشنز کی دھندلی اور بلیک اینڈ وائٹ فوٹیج نے خلا کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا تھا۔ اور اگرچہ یہ فوٹیج دیکھنے والوں میں سے صرف چند خوش نصیب ہی خلاباز بن سکے، لیکن ان تصاویر کو دیکھ کر ہی بہت سے لوگ سائنس، ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کے شعبوں میں کیریئر بنانے نکل پڑے۔ اب امید کی جا رہی ہے کہ آرٹیمس مشنز، جو دنیا بھر میں براہِ راست نشر ہوں گے نئی نسل کو متاثر کریں گے۔

سائنس میوزیم کی سپیس ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ لبی جیکسن کہتی ہیں کہ 'ہم ایک ٹیکنالوجی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں

سائنسدانوں، انجینئروں اور ریاضی دانوں کی ضرورت ہے اور خلا میں یہ شاندار صلاحیت ہے، لوگوں کو ان مضامین کے بارے میں پُرجوش کرے۔'

نئی ملازمتیں اور ایک ترقی پذیر خلائی معیشت امریکہ کو ان اربوں ڈالرز کا فائدہ دے گی جو اس نے آرٹیمس دوم میں لگائے ہیں۔ اسی طرح وہ ٹیکنالوجی بھی فائدہ دے گی جو مشنز کے لیے تیار کی گئی اور زمین پر بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

لیکن ہیلن شارمن کہتی ہیں کہ چاند پر واپسی دنیا کو بھی ایک نہایت ضروری حوصلہ دے گی۔ 'اگر ہم واقعی اکٹھے ہو جائیں، تو ہم انسانیت کے لیے بے شمار فائدے پیدا کر سکتے ہیں۔'

شارمن کہتی ہیں کہ 'یہ ہمیں دکھاتا ہے کہ انسان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔'

☆.....☆

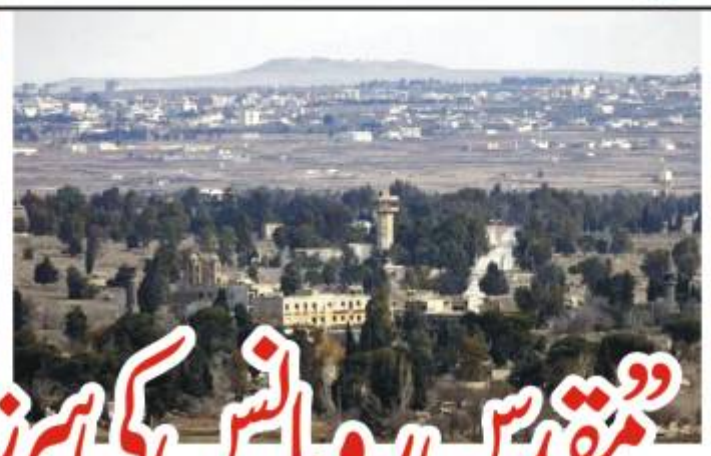

”مقدس رومانس کی سرزمین“

گولان پناہ کا شہر جس پر حکمرانی ہر سلطنت کا خواب رہا

شام میں بشارالاسد کی حکومت کے خاتمے کے بعد اسرائیل کی جانب سے گولان کی پہاڑیوں پر یہودی آبادکاری کو وسعت دینے کے فیصلے کے بعد سے اس علاقے کی مشرقِ وسطیٰ میں سٹریٹیجک اہمیت ایک بار پھر موضوعِ بحث ہے۔ گولان کی پہاڑیاں شام کے جنوب میں واقع ہیں اور یہ شام اور اسرائیل کے درمیان سرحد کا ایک حصہ ہیں۔ اس خطے کی حیثیت متنازع ہے اور جہاں امریکہ نے سنہ 2019 میں اسے اسرائیل کا حصہ تسلیم کیا تھا وہیں اقوامِ متحدہ اور دیگر ممالک کے نزدیک گولان وہ شامی علاقہ ہے جس پر اسرائیل نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ جہاں اس علاقے کی سٹریٹیجک اہمیت ہے وہیں اس کی مذہبی اہمیت اور قدیم تاریخ کے بارے میں کم ہی بات ہوتی ہے تاہم یہودی آبادکاروں کی جانب سے اس حوالے سے مختلف دعوے کیے جاتے رہے ہیں۔

کتاب ’دی جائنٹ سٹیز آف بشان اینڈ سریاز ہولی پلیسز‘ میں اس علاقے کو ’مقدس رومانس کی سرزمین‘ کہا گیا ہے جس کے بارے میں ’قدیم بادشاہتوں سے جڑی پراسرار اور عجیب‘ کہانیاں آج بھی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جس جگہ کو آج ’گولان ہائٹس‘ کا نام دیا جاتا ہے یہ اور اس کے اردگرد کے کچھ علاقے یوں تو اب ملکوں کی سرحدوں کی درمیان تقسیم ہو چکے ہیں لیکن قدیم زمانے میں اس علاقے کو ’بشان‘ کا نام دیا جاتا تھا۔

بشان یہاں کے مویشیوں اور بلوط کے درختوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ گولان کی پہاڑیاں اس خطے میں، جو زیادہ تر بنجر زمین پر مشتمل ہے، پانی کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

گولان کی پہاڑیوں اور بشان کے خطے پر مختلف ادوار میں مختلف سلطنتوں کی حکمرانی رہی جن میں رومن سلطنت، بازنطینی سلطنت، پھر چھٹی صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں اور ترکوں کی حکمرانی رہی۔ گولان میں یہودی آبادکاریاں سنہ 1880 کے بعد سے ہونا شروع ہوئی تھیں۔

بشان خطے میں جولان (موجودہ گولان) ایک شہر تھا جسے انجیل میں ’چھ پناہ کے شہروں‘ میں سے ایک قرار دیا گیا۔ یہ شہر وہ تھے جن میں ایسے لوگ پناہ لے سکتے تھے جنھوں نے کسی کا حادثاتی طور پر قتل کیا ہو۔ جان آر میکڈف کی کتاب ’دی سٹیز آف ریفیج‘ کے مطابق پیغمبر موسیٰ پر نازل کیے گئے قوانین کے مطابق جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنے والے کو سزائے موت دی جاتی لیکن اگر کسی سے قتلِ خطا ہو جاتا تو وہ کسی ’پناہ کے شہر‘ میں ٹھہر سکتا تھا جہاں اسے کسی بھی بدلے کا ڈر نہ ہوتا۔ یہاں یہ شخص اس وقت تک ٹھہر سکتا تھا جب تک مقدمہ عدالت میں نہ چل جاتا اور یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ یہ واقعی قتلِ خطا تھا۔ اس حوالے سے تورات کی پانچویں کتاب ڈیوٹرانمی میں بھی حوالے موجود ہیں جبکہ کتاب یشوع میں بھی اس کا ذکر ہے۔ انجیل میں کتاب ڈیوٹرانمی میں بشان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔

انجیل کے اولڈ ٹیسٹامنٹ میں درج ہے کہ پیغمبر موسیٰ جب بنی اسرائیل کو لیے بشان کے علاقے میں پہنچے تو یہاں کے طاقتور بادشاہ اوگ سے ان کی جنگ ہوئی۔ انجیل کے مطابق خدا کی جانب سے پیغمبر موسیٰ کو یہ یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ انھیں بادشاہ اوگ پر فتح حاصل ہوگی۔ اس وقت بنی اسرائیل کے لیے بشان پر قبضہ اس لیے بھی ضروری تھا کیونکہ یہ ایک زرخیز جگہ تھی اور اسے فتح کرنے کے بعد انھیں اس زمین تک پہنچنے میں آسانی ہو جانی تھی جس کے بارے میں تورات کے مطابق خدا کی جانب سے پیغمبر ابراہیم اور ان اولاد سے وعدہ کیا گیا تھا۔

بادشاہ اوگ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انتہائی طاقتور انسان تھا۔ کتاب ’فوربڈن پاتھز ان دی لینڈ آف اوگ‘ کے مطابق اوگ اپنی سلطنت سے بنی اسرائیل کو گزرنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا اور اسی لیے پیغمبر موسیٰ کو اس سے جنگ کرنی پڑی۔

کتاب ’دی جائنٹ سٹیز آف بشان اینڈ سریاز ہولی پلیسز‘ کے مطابق گولان کی پہاڑیوں کی بلندیوں سے بہہ کر نیچے آنے والا بارش کا پانی دریائے اردن میں داخل ہوتا ہے جو اسرائیل میں موجود بحیرہ طبریا میں پانی کی فراہمی یقینی بناتا ہے۔ اس کی بدولت اس دریا کے اِردگرد کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ یہاں انگور اور دیگر پھلوں کے باغات ہیں جبکہ یہ زمین مویشیوں کے لیے چراگاہیں بھی فراہم کرتی ہے۔

یہی وہ پانی کا ذریعہ ہے جس کے باعث اسرائیل کے لیے اس خطے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بحیرہ طبریہ یوں تو اسرائیل میں ہی موجود ہے اور اس کا شمار موجود گولان ہائٹس یا ماضی کے بشان کے خطے میں نہیں کیا جاتا لیکن اس کے حوالے سے انجیل کے نیو ٹیسٹامنٹ میں پیغمبر عیسیٰ کے چند واقعات ضرور موجود ہیں۔

پیغمبر عیسیٰ کا بحیرہ طبریہ کے پانیوں پر چلنے کا معجزہ انجیل کی کتابوں میتھیو، مارک اور جان میں درج ہے۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ ’جب پیغمبر عیسیٰ کے ماننے والوں کو بحیرہ طبریہ میں طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ پانی پر چلتے ہوئے ان کی کشتی تک پہنچتے ہیں اور انھیں بچانے کے لیے طوفان کو تھمنے کا حکم دیتے ہیں۔‘

اس کے علاوہ عبرانی انجیل یا اولڈ ٹیسٹامنٹ میں کتاب ’جینیسز‘ میں خدا کی جانب سے پیغمبر ابراہیم سے کیا گیا وعدہ بھی درج ہے جس میں کہا گیا ’خدا نے تمھاری اولاد کو دریائے مصر سے عظیم دریا، دریائے فرات تک کی زمین دے دی ہے۔‘

گولان کی پہاڑیوں پر کون رہتا ہے؟

گولان کی پہاڑیوں پر ماضی میں آباد زیادہ تر شامی عرب باشندے سنہ 1967 کی جنگ کے دوران اس علاقے سے نقل مکانی کر گئے تھے۔ گولان کے علاقے میں اب 30 سے زائد اسرائیلی بستیاں موجود ہیں جن میں ایک اندازے کے مطابق 20,000 افراد رہائش پذیر ہیں۔ اسرائیلیوں نے 1967 کے تنازعے کے اختتام کے فوراً بعد اس علاقے میں آبادیاں بنانی شروع کر دیں تھیں۔ یہ یہودی بستیاں بین الاقوامی قانون کے تحت غیر قانونی تصور کی جاتی ہیں مگر اسرائیل اس سے اختلاف کرتا ہے۔ یہ یہودی آبادکار یہاں بسنے والے ان تقریباً 20,000 شامیوں کے ساتھ رہتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق دروز فرقے سے ہے اور جو گولان پر اسرائیلی قبضے کے دوران یہاں سے نکلے نہیں تھے۔

شام کا کہنا ہے کہ یہ سرزمین (گولان کی پہاڑیاں) ہمیشہ سے اس کی ملکیت ہیں اور وہ بارہا اس علاقے کو واپس لینے کے عزم کا اظہار کر چکا ہے جبکہ اسرائیل کا کہنا ہے کہ گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کے دفاع کے لیے بہت اہم ہیں اور ان کا کنٹرول ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہے گا۔

☆.....☆

بشان یہاں کے مویشیوں اور بلوط کے درختوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ گولان کی پہاڑیاں اس خطے میں، جو زیادہ تر بنجر زمین پر مشتمل ہے، پانی کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

گولان کی پہاڑیوں اور بشان کے خطے پر مختلف ادوار میں مختلف سلطنتوں کی حکمرانی رہی جن میں رومن سلطنت، بازنطینی سلطنت، پھر چھٹی صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں اور ترکوں کی حکمرانی رہی

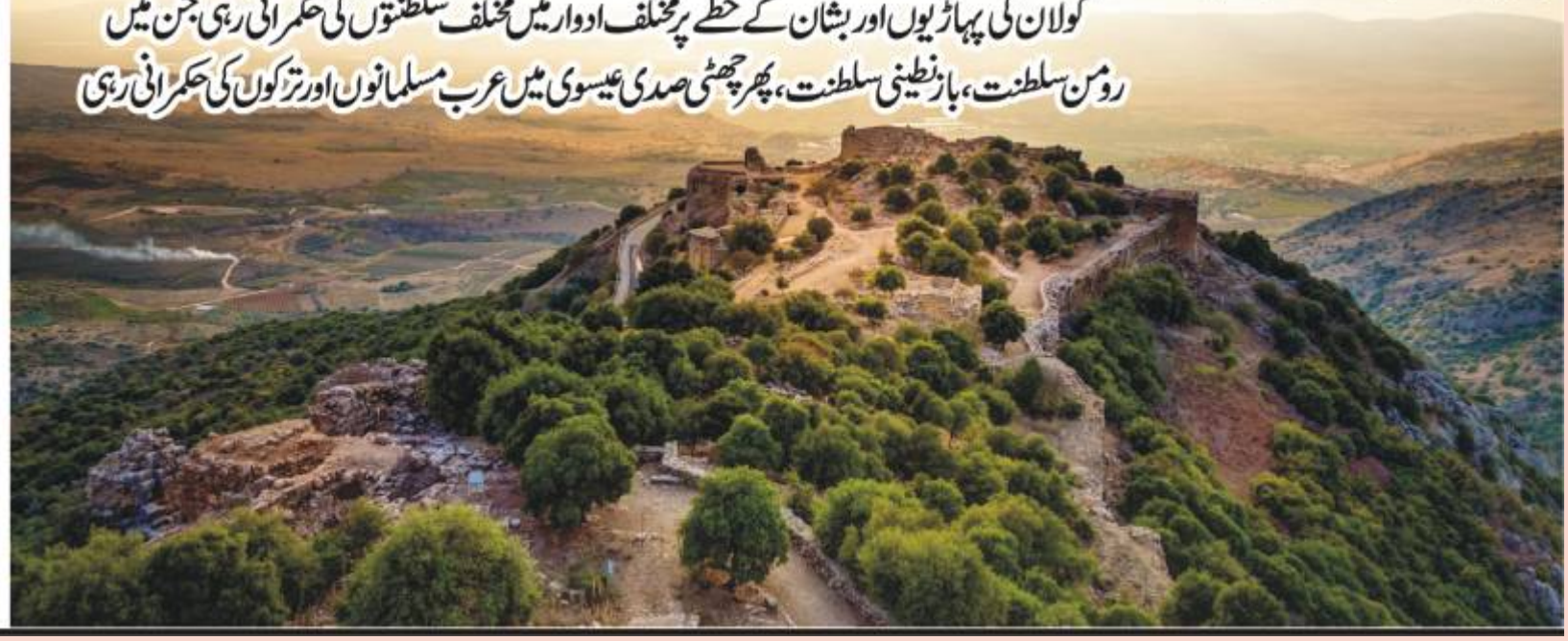

(بقیہ: فرخ شہباز وڑائچ)

اگر کوئی شخص بات کر رہا ہے تو اس کا بیک گراؤنڈ دیکھا جاتا ہے کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ واقعی ممکن ہے یا نہیں۔ پھر مختلف ذرائع سے تصدیق کی جاتی ہے۔

مہر علی: سوشل میڈیا نے آپ کی صحافت پر کیا اثر ڈالا ہے؟

جواب: میرے خیال میں چیزیں بہتر بھی ہوئی ہیں اور کچھ مشکل بھی ہوئی ہیں۔ لوگوں کا یقین کچھ کم ہوا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ خبر سچ ہے یا نہیں۔ یہ ایک مشکل ہے۔ باقی چیزیں آسان ہوگئی ہیں۔ پہلے چینل یا اخبار کے ذریعے معلومات شیئر کرنی پڑتی تھیں، اب گھر بیٹھے فیس بک اور دیگر ایپس کے ذریعے بھی شیئر کیا جاسکتا ہے۔

مہر علی: کیا سوشل میڈیا نے صحافیوں کیلئے آسانیاں پیدا کی ہیں یا مشکلات؟

جواب: میرے خیال میں آسانیاں پیدا کی ہیں، خاص طور پر فری لانسنگ یا انفرادی صحافت کے حوالے سے۔ اس سے بہتر مواقع ملے ہیں جو پہلے اداروں کے بغیر ممکن نہیں تھے۔ اب پلیٹ فارمز زیادہ ہیں اور مواقع بھی بہتر ہوئے ہیں۔

مہر علی: کیا کبھی آپ پر خبر بدلنے یا پروگرام رکوانے کا دباؤ آیا؟ آپ نے کیسے ہینڈل کیا؟

جواب: بعض اوقات ایسی نوعیت کی باتیں ہوئیں کہ ویڈیو ڈیلیٹ کرنے کا کہا گیا۔ اس پر ہم نے یہی کہا کہ آپ اپنا مؤقف دے دیں۔ اگر کوئی بات بری لگی ہے تو فیکٹس سامنے رکھیں، ہم وہ بھی پبلش کر دیں گے۔ اس طرح سینئرز کی مدد سے معاملہ منیج کیا۔

مہر علی: جو نوجوان صحافت میں آنا چاہتے ہیں، انہیں کیا مشورہ دیں گے؟

جواب: وہ تیاری کے ساتھ آئیں اور یہ سوچ کر آئیں کہ دن رات کام کرنا پڑسکتا ہے۔ یہ محنت طلب کام ہے۔ صحافت ایک وسیع شعبہ ہے جس میں ہر موضوع پر بات ہوتی ہے، اس لیے اپنی نالج اور زبان بہتر کر کے آئیں۔ وقت کا اندازہ نہیں ہوتا، کسی بھی وقت کام کرنا پڑسکتا ہے۔ یہ دیگر شعبوں کی طرح آسان نہیں، بلکہ نسبتاً دشوار راستہ ہے۔

مہر علی: آج کل میڈیا پر عوام کا اعتماد کیوں کم ہو رہا ہے؟

جواب: شاید میڈیا یا ادارے عوام کے جذبات کے مطابق مواد پیش نہیں کر پا رہے، جس کی وجہ سے لوگوں کو لگتا ہے کہ مکمل سچ ان کے سامنے نہیں آ رہا۔

مہر علی: پاکستان میں صحافت کے مستقبل کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: اگر صحافت آزادی کی طرف بڑھے تو مستقبل بہت بہتر اور شاندار ہے۔ اگر پابندیاں رہیں تو مشکلات ہوں گی، لیکن صحافت بہرحال جاری رہے گی کیونکہ یہ معاشرے کا حسن ہے۔

مہر علی: اگر آپ صحافت میں نہ ہوتے تو کیا بننا پسند کرتے؟

جواب: شاید میں استاد ہوتا۔ میں اس وقت بھی پنجاب یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں، لیکن شاید مکمل طور پر تدریس کے شعبے میں ہوتا۔

☆.....☆

(بقیہ: ایران کی حیران کن حکمت عملی)

۔وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی قیادت کی جانب سے صدر ٹرمپ کی خوشامد کا جو طریقہ اپنایا گیا، اس نے اپنا کام دکھایا ہے اور اس سے پاکستان واشنگٹن کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اُن کے بقول اب پاکستان ٹرمپ انتظامیہ کی نظر میں ایک پُرکشش سہولت کار اور ثالث کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ لیکن امریکہ کے ساتھ تعلقات کا کارڈ ہی پاکستان کے لیے کافی نہیں ہے۔ پروفیسر صدیقی کہتے ہیں کہ پاکستان کو یہ احساس ہوا ہے کہ وقت کے مطابق خود کو ڈھالنا ہی علاقائی سفارتکاری میں آگے بڑھنے کا راستہ ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ’ہم آج جس قسم کی دُنیا دیکھ رہے ہیں، اس میں درمیانی قوتیں بڑی طاقتوں کے ساتھ چلنے میں زیادہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔‘ اُن کے بقول پاکستان جن وجوہات کی بنا پر اس تنازع کے حل کے لیے موزوں سمجھا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ اسرائیل اور امریکہ نواز ہونے کی ساکھ نہیں رکھتا۔

لیکن اب بھی پاکستان کو بہت سے سوالات کا سامنا ہے اور اس تنازع کے حل کے لیے کوئی امن معاہدہ بھی ڈور کی بات لگتی ہے۔ کوئلمین کہتے ہیں کہ کسی بھی امن معاہدے کے امکانات بہت زیادہ نہیں ہیں، کیونکہ امریکہ اور ایران کے درمیان بداعتمادی کی خلیج بہت وسیع ہو چکی ہے اور دونوں ممالک کے مطالبات بھی ایک دوسرے متصادم ہیں۔ اُن کے بقول پاکستان کے لیے اُس وقت زیادہ مشکل ہوگی جب یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا تو پھر آگے کا راستہ کیا ہوگا۔ یہ جنگ ابھی جاری ہے۔ ایران کی حکمت عملی نے ثابت کیا کہ بقا کی جنگ میں عزم، منصوبہ بندی اور اتحادیوں کا جال سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ امریکہ اور اسرائیل کو اب بین الاقوامی تنقید، معاشی دباؤ اور فوجی تھکن کا سامنا ہے۔ جبکہ پاکستان نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ سفارتکاری کی دنیا میں غیر متوقع کھلاڑی ہی سب سے بڑا فرق پیدا کر سکتے ہیں۔ تاریخ کے اس موڑ پر، جہاں طاقت کا توازن بدل رہا ہے، ایران کی مزاحمت اور پاکستان کی ثالثی دونوں ایک نئی کہانی رقم کر رہے ہیں۔ یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، مگر اس کا انجام یقیناً عالمی سیاست کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دے گا۔

☆.....☆

(بقیہ: پاکستان افغانستان کے مابین آرمچی میں مذاکرات)

منصور خان کہتے ہیں کہ اگر چین کی ثالثی کے نتیجے میں پاکستان اور افغانستان کسی معاہدے پر پہنچ جاتے ہیں تو یہ ایک خوش آئند پیشرفت ہوگی۔

اس تجزیے سے واضح ہے کہ ارمچی مذاکرات ایک اہم قدم ہیں، لیکن مستقل سیز فائر کے لیے گہری سمجھوتہ کاری درکار ہے۔ چین کی ثالثی علاقائی استحکام لا سکتی ہے، جبکہ اس کی تجارتی دلچسپی افغانستان کو معاشی طور پر زندہ رکھ سکتی ہے۔ تاہم، تاریخ بتاتی ہے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں وقت لگتا ہے۔ مستقبل کی سمت بتاتی ہے کہ پیچیدہ بین جنگ خطے کا کلیدی کھلاڑی بن چکا ہے۔

☆.....☆

(بقیہ: ری پبلک ہوسلو جامستان)

ہزاروں دوسرے شہری بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ ریگستان سے عالمی منظر نامے تک کا سفر ہے۔ دنیا بھر میں سینکڑوں مائیکرو نیشنز موجود ہیں۔ اگلے سال سلو جامستان مائیکرو کون 2027 کی میزبانی کرے گا جہاں 43 سے زائد خود ساختہ ریاستوں کے نمائندے جمع ہوں گے۔ یہاں کردار سازی اور سحرانی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ سلطان کہتے ہیں کہ مہمانوں کا خیر مقدم ہے مگر ابھی رات گزارنے کی سہولت نہیں۔ ان کے لیے یہ سب ان کے سفر کے جنون سے جڑا ہے۔ ایک از بک شہری کا پیغام انہوں نے یاد کیا جسے انہوں نے تصاویر دکھا کر بتایا کہ میں تمہارے ملک جا چکا ہوں۔ مئی 2023 میں وہ آخری ملک ترکمانستان بھی جا چکے۔ اب سلو جامستان محض خلا بھرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو ثقافتوں اور سرحدوں کے پار لوگوں کو جوڑتا ہے۔ سلطان کہتے ہیں کہ یہ ملک میرا نہیں، میں ایک آمر ہوں مگر حقیقت میں یہ سب کا ہے۔ ہر شخص کے لیے اس کا مطلب مختلف ہے۔ یہاں سب اپنی سوچ کے ساتھ آ سکتے ہیں۔

اس صحرا کی سلطنت میں داخل ہوتے ہی آپ کو لگتا ہے کہ وقت رک گیا ہے۔ ریت کے ذرے ہوا میں اڑتے ہوئے کہانیاں سناتے ہیں۔ کھجور کے درخت سایہ دیتے ہیں جبکہ دور میں وہ آبدوز جیسی شکل ایک پراسرار کہانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ جگہ گاڑی چلاتے لوگوں کے لیے عام نظر آتی ہے مگر جو اندر آتا ہے وہ کبھی واپس نہیں جا پاتا۔ اس کی وجہ صرف قوانین نہیں بلکہ اس کی روح ہے — ایک روح جو مزاح سے بھری ہے، تخیل سے لبریز ہے اور آزادی کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ سلطان رینڈی ولیمز نے جو کچھ بنایا ہے وہ صرف ایک مائیکرو نیشن نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، ایک یاد دہانی ہے کہ انسانی ذہن کتنا طاقتور ہے۔ وہ بچپن کی تخلیقی صلاحیتوں کو، ریڈیو کی دنیا کو، سفر کے جنون کو اور لاک ڈاؤن کی بے چینی کو ایک جگہ لا کر ایک ایسی چیز تخلیق کر گئے جو آج لاکھوں لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ ہر پاسپورٹ، ہر سکہ، ہر جھنڈا اور ہر تقریب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تخیل کی کوئی حد نہیں۔ جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ نہ صرف ایک نئی شہریت لیتے ہیں بلکہ ایک نئی امید بھی لے جاتے ہیں۔ یہاں سیاست نہیں، صرف خوشی ہے۔ یہاں تنازع نہیں، صرف بھائی چارہ ہے۔ یہاں تنگی نہیں، صرف وسعت ہے۔ ریگستان کی یہ سلطنت آج بھی پھیل رہی ہے، اس کی کہانیاں پھیل رہی ہیں اور اس کے شہری دنیا بھر میں اپنے خوابوں کو سلو جامستان کی مٹی سے جوڑ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں آپ تھوڑی سی فیس دے کر پارلیمنٹ کا رکن بن سکتے ہیں مگر حقیقت میں یہاں ہر شہری ایک سلطان ہے، ہر دل ایک بادشاہ ہے اور ہر لمحہ ایک نئی آزادی کا جشن ہے۔

☆.....☆

(بقیہ: آبنائے باب المندب تجارتی راستے کی ممکنہ بندش

آج اس راستے کی بندش توانائی کے بازار کے بحران کو مزید سنگین بنا دے گی جو پہلے ہی آبنائے ہرمز کی صورتحال سے انتہائی دباؤ کا شکار ہے، خلیج میں شپنگ کی راہ میں رکاوٹ نے برینٹ خام تیل کی قیمت کو آسمان چھوتے ہوئے بڑھا دیا ہے، یاد رہے کہ یکم اپریل کو برینٹ خام تیل کی مئی کے مہینے میں فراہمی کے لیے مارچ میں ہونے والے سودوں میں ریکارڈ 64 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے اور ماہرین کے مطابق یہ 1990 کی خلیجی جنگ کے بعد سب سے زیادہ ماہانہ اضافہ ہے، عالمی تجارت جو عام صارفین کی مصنوعات سے لے کر زرعی اجناس تک پھیلی ہوئی ہے بھی اس کے اثرات محسوس کر رہی ہے، ایک اور اہم بحری راستے میں خلل اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو مزید بڑھا سکتا ہے اور ایران کے ساتھ تنازع کے معاشی اثرات کو مزید گہرا کر سکتا ہے، اس طرح یہ بحران نہ صرف تیل کی قیمتوں بلکہ عالمی افلیشن، سپلائی چین کی رکاوٹ اور غریب ممالک میں غذائی عدم تحفظ کو بھی جنم دے سکتا ہے، پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک جو تیل کی درآمد پر انحصار کرتے ہیں ان کی معیشت پر اس کا براہ راست دباؤ پڑے گا اور لاہور جیسے شہروں میں روزمرہ زندگی کی لاگت میں اضافہ دیکھا جاسکتا ہے۔

تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی حکمت عملی تاریخ کا ایک ایسا سبق ہے جو ایران کی جنگ میں نئی جہت اختیار کر رہا ہے، کیا یہ ٹرمپ کا سویز بحران بن جائے گا، ایک ماہ قبل ایران کے خلاف شروع کی جانے والی امریکی اور اسرائیلی جنگ میں اس وقت صرف ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے اور وہ اس کی غیر یقینی کیفیت ہے، شاید یہ حیران کن نہیں کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے سوشل میڈیا پر جاری بیانات اس بحران کو مزید گہرا کرتے ہوئے عالمی منڈیوں کو مسلسل جھٹکے دے رہے ہیں، لیکن اس جنگ کی سمت طے کرنے میں صرف ٹرمپ کے بیانات کا نہیں بلکہ تاریخ کا بھی کردار نظر آرہا ہے، اس تنازع کے آغاز کے بعد سے ماہرین ماضی پر نظریں دوڑا رہے ہیں تاکہ حالیہ کشیدگی کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور آگے کیا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ لگا سکیں، اس کوشش میں کم از کم تین تاریخی واقعات اہم لگتے ہیں جن میں سب سے پہلے سویز بحران کا ذکر ضروری ہے، یمن کے حوثی باغیوں کی جانب سے جمعہ کے دن اسرائیل پر کیے گئے پہلے میزائل حملوں کے بعد ایران کی جنگ میں ایک نیا محاذ کھل گیا ہے، ایرانی حمایت یافتہ حوثی گروہ کی باقاعدہ شمولیت کے بعد عالمی معیشت کے مزید متاثر ہونے کا خدشہ بڑھ گیا ہے کیونکہ حوثی بحیرہ احمر میں خصوصاً نہر سویز میں شپنگ کو نشانہ بنا سکتے ہیں، اگرچہ یہ گروہ اس اہم سمندری راستے کو مکمل طور پر بند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن سویز تک رسائی کو محدود کرنے کی ضرور صلاحیت رکھتا ہے، یاد رہے کہ سویز کینال سے 30 فیصد عالمی کنٹینر ٹریفک اور تیل و گیس کی عالمی رسد کا تقریباً 15 فیصد گزرتا ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ آبنائے ہرمز کے ساتھ ساتھ اگر سویز تک رسائی متاثر ہوئی تو عالمی معیشت پر بہت بڑا اثر ہوگا، اس تمام پیش رفت کے 70 سال قبل سویز بحران کی جانب توجہ مبذول کرائی جارہی ہے جب مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے 1956 میں سویز کو قومیانے ہوئے تیل کی رسد کے اس اہم راستے پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا اور اس کے جواب میں فرانس، برطانیہ اور اسرائیل نے ناکام کوشش کی تھی، ٹرمپ اور ان کے اسرائیلی اتحادی وزیراعظم نیتن یاہو کے لیے اس تاریخ میں کئی اہم سبق موجود ہیں، جیریمی یوون کا کہنا ہے کہ اس وقت برطانیہ کی عالمی طاقت کی حیثیت ختم ہوگئی تھی جو پہلی عالمی جنگ کے بعد سے مشرق وسطیٰ میں طاقت کا حامل تھا اور یہ واقعہ اس طاقت کے اختتام کا آغاز تھا، تہران اور حوثیوں کی تیل و گیس کی رسد کو محدود کرنے کی حکمت عملی 70 سال قبل مصر کے اقدام جیسی ہے، امریکی مورخ الفریڈ مکوئے کہتے ہیں کہ برطانوی اور فرانسیسی فوجیں سویز کے شمالی کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی مصری فوج نے درجنوں جہاز ڈبو دیے تھے، نہر بند کردی تھی اور یورپ تک تیل کی رسائی ختم ہوچکی تھی، اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور کو خدشہ تھا کہ سرد جنگ میں سوویت یونین کے ساتھ نیا محاذ نہ کھل جائے اس لیے انہوں نے برطانیہ اور فرانس کو پسپا ہونے پر مجبور کیا، الفریڈ کے مطابق اس وقت تک برطانیہ پر اقوام متحدہ میں پابندیاں لگ چکی تھیں، اس کی کرنسی کمزور ہوچکی تھی اور عالمی طاقت کا تاثر ختم ہوچکا تھا، جیریمی یوون کا کہنا ہے کہ آج کے امریکہ کی طاقت کا موازنہ اس وقت کی برطانوی طاقت سے نہیں کیا جاسکتا لیکن ہر طاقت اونچ نیچ کا شکار ہوتی ہے اور چین کی بڑھتی طاقت کی وجہ سے اگر مستقبل میں امریکی زوال پر لکھا جائے تو یہ جنگ ایک ایسا موقع ثابت ہوسکتی ہے جہاں نتائج کے بارے میں زیادہ سوچے بغیر امریکہ داخل ہوا، ممکنہ نتائج کو سمجھنے کے لیے بھی یہ 70 سال پرانی تاریخ ہماری مدد کرسکتی ہے۔

1973 میں تیل کا جھٹکا ایک اور تاریخی مثال ہے جو ماہرین کے مطابق ایران کی جنگ کے نتیجے میں اہم معاشی شاہ رگ کی بندش سے عالمی معیشت کو نقصان پہنچانے کا اندیشہ پیدا کرتی ہے، جیریمی یوون کے مطابق اسرائیل کی شام اور مصر کے خلاف جنگ کے دوران امریکی مدد کے بعد عرب دنیا نے تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اس کی قیمتوں میں اضافے سے مغربی یورپ کو شدید نقصان پہنچایا، اس وقت کے سعودی وزیر تیل شیخ احمد زکی نے واضح طور پر کہا تھا کہ تیل کو اثر و رسوخ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور عرب دنیا کی تیل پر اجارہ داری ایک ہتھیار ہے جو عالمی معیشت کو تیزی سے گرا سکتا ہے، پانچ ماہ تک جاری رہنے والی اس حکمت عملی کے اثرات ایک دہائی تک محسوس کیے جاتے رہے، امریکہ میں مہنگائی بڑھی اور افراط زر میں اضافہ ہوا، اگرچہ آج تیل کی کھپت میں کمی اور دیگر وسائل کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوئی ہے لیکن اب بھی یہ توانائی کا اہم ذریعہ ہے، امریکہ آج اپنی ضرورت سے زیادہ توانائی پیدا کرتا ہے لیکن خام تیل بڑی مقدار میں درآمد کرتا ہے جس کی وجہ سے عالمی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے امریکی صارفین متاثر ہوں گے، اگر امریکی شراکت دار ایشیا متاثر ہوئے تو اس کا اثر امریکی منڈی میں بھی محسوس کیا جائے گا، جیریمی یوون کا کہنا ہے کہ سعودی اور اماراتی یورپ کو تیل نہ بیچنے کا کہہ رہے ہیں لیکن ایران اور حوثی تیل کی رسد کو مشکل بنا رہے ہیں جس سے بہت مسائل پیدا ہوں گے، یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ تیل کا بطور ہتھیار استعمال آج بھی اپنی معنویت کھو نہیں چکا بلکہ جدید ٹیکنالوجی اور ڈرونز کے دور میں مزید خطرناک ہوگیا ہے۔

ایران عراق جنگ 1980 کی دہائی میں صدر ٹرمپ کے لیے سب سے اہم مثال پیش کرتی ہے کہ واشنگٹن کے مخالفین معاشی راستوں کو کیسے بند کرسکتے ہیں، اس جنگ کے اختتامی مراحل میں آبنائے ہرمز سے گزرنے والے جہازوں کو دونوں طرف سے نشانہ بنایا گیا جس کا مقصد عالمی طاقتوں کو تنازع میں شامل کرنا تھا، کویت نے اپنے جہازوں کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی مدد مانگی اور امریکہ نے اس لیے حامی بھری کیونکہ اسے سوویت یونین کے دخل کا ڈر تھا، آپریشن ارجیسٹ ول کے تحت 1987 میں امریکی جہاز آئل ٹینکرز کی حفاظت کے لیے چلنے لگے لیکن برجٹن نامی امریکی جہاز کو ایرانی بارودی سرنگ نے نشانہ بنا دیا، ماہرین کے مطابق اس سے پتہ چلتا ہے کہ آبنائے ہرمز میں بارودی سرنگوں کے خلاف امریکی اہلیت ناکافی تھی، آج کے تنازع میں ٹرمپ دوسرے ملکوں سے مدد مانگ رہے ہیں لیکن مسئلہ زیادہ بڑا ہے کیونکہ ڈرونز شامل ہوچکے ہیں اور ایران عراق جنگ میں مصروف نہیں ہے، تاریخ آج مشرق وسطیٰ کے تنازع میں شریک قوتوں کو بہت سے سبق فراہم کرتی ہے، لیکن یہ قوتیں اسے کیسے دیکھتی ہیں اس سے تنازع کا رخ اور طوالت طے ہوگی، اس طرح باب المندب کی ممکنہ بندش نہ صرف تیل کی قیمتوں کو بڑھائے گی بلکہ عالمی تجارت، معیشت اور امن کو بھی نئی شکل دے سکتی ہے، یہ بحران پاکستان جیسی ریاستوں کے لیے بھی چیلنج ہے جہاں توانائی کی قلت معاشی ترقی کو روک سکتی ہے،

اس بحران کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھیں تو باب المندب کی بندش کے ممکنہ اثرات نہ صرف توانائی کی سپلائی پر بلکہ عالمی ماحولیات، غذائی سلامتی، اور حتیٰ کہ کلائمیٹ چینج کی لڑائی پر بھی پڑیں گے، کیونکہ متبادل راستوں کا استعمال جہازوں کی مسافت بڑھا دے گا جو کاربن اخراج میں اضافے کا باعث بنے گا، افریقہ اور ایشیا کے درمیان تجارت کی لاگت میں اضافہ غریب ممالک میں بھوک اور عدم استحکام کو بڑھا سکتا ہے، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر خلیجی ریاستوں کی معیشت جو تیل پر انحصار کرتی ہے اس سے شدید متاثر ہوگی، جبکہ چین اور بھارت جیسے بڑے درآمد کنندگان کو نئی حکمت عملی اپنانا پڑے گی، امریکہ کی اندرونی توانائی پیداوار اسے کچھ تحفظ دے سکتی ہے لیکن عالمی منڈی کی عدم استحکام اس کے اتحادیوں کو متاثر کرے گی، ایران کی یہ حکمت عملی نہ صرف اس کی علاقائی طاقت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اسے عالمی سطح پر ایک کھلاڑی کے طور پر پیش کرتی ہے جو بڑی طاقتوں کو چیلنج کرسکتا ہے، حوثیوں کی شمولیت اسے ایک پراکسی جنگ کا روپ دے رہی ہے جہاں مقامی تنازعات عالمی سطح پر پھیل رہے ہیں، تاریخ کے سبق سے سیکھتے ہوئے آج کی قیادت کو سوچنا چاہیے کہ سویز بحران 1973 کا تیل جھٹکا اور ایران عراق جنگ نے کس طرح طاقت کے توازن کو تبدیل کیا۔

اس طویل اور مفصل تجزیے میں ہم نے دیکھا کہ آبنائے باب المندب کی 36 کلومیٹر چوڑائی میں دنیا کی تقدیر چھپی ہوئی ہے، اس کی بندش سے پیدا ہونے والا خلا نہ صرف تیل کی 12 فیصد ترسیل بلکہ عالمی تجارت کے 25 فیصد حصے کو متاثر کرسکتا ہے، روزانہ 50 لاکھ بیرل تیل اور 8 فیصد ایل این جی کی رکاوٹ سے معاشی دھڑکنیں رک سکتی ہیں، حوثیوں کی میزائل اور ڈرون کی صلاحیت، ایران کی دھمکیاں اور ٹرمپ کی بیان بازی سب مل کر ایک ایسا طوفان کھڑا کر رہے ہیں جو تاریخ کے آئینے میں سویز اور 1973 کی یاد دلاتا ہے، مگر امید کی کرن یہ ہے کہ عالمی برادری، اقوام متحدہ اور خطے کی طاقتیں مل کر اسے حل کریں گی، پاکستان جیسے ممالک کو اپنی توانائی کی خود مختاری بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ایسے بحرانوں سے بچا جاسکے، لاہور کے شہریوں سے لے کر عالمی رہنماؤں تک سب کو یہ سوچنا چاہیے کہ سمندر کی لہریں امن کی لہریں بنیں نہ کہ تباہی کی، کیونکہ باب المندب کا نام آنسوؤں کا دروازہ ہے مگر یہ امید کا دروازہ بھی بن سکتا ہے اگر حکمت غالب آئے، یہ بحران نہ صرف معاشی بلکہ اخلاقی اور سیاسی امتحان ہے جو طاقت کے درست استعمال کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، تاریخ بار بار دہراتی ہے کہ جنگیں سلطنتوں کو تباہ کرتی ہیں جبکہ امن ترقی لاتا ہے، اس لیے عالمی قیادت کو اس سبق پر عمل کرنا چاہیے تاکہ آنے والی نسلیں باب المندب کو ترقی کے راستے کے طور پر یاد رکھیں نہ کہ تباہی کے۔

☆.....☆

(بقیہ: ایران امریکہ اسرائیل جنگ کا 35 واں دن

پاکستان میں حالیہ دنوں میں پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے جس نے عوام الناس کی زندگی کو شدید متاثر کیا ہے۔ حکومت نے 3 اپریل 2026 سے پٹرول کی فی لیٹر قیمت 458 روپے 40 پیسے اور ڈیزل کی 520 روپے 35 پیسے کردی ہے جو کہ پچھلے ہفتوں کے مقابلے میں پٹرول میں 137 روپے اور ڈیزل میں 184 روپے کا تاریخی اضافہ ہے۔ یہ اضافہ اس وقت ہوا جب عالمی سطح پر خام تیل کی قیمتیں ایران کے ساتھ امریکہ اور اسرائیل کی جنگ کی وجہ سے آسمان چھو رہی ہیں اور آبنائے ہرمز جو دنیا کے 20 فیصد تیل کی ترسیل کا ذریعہ ہے تقریباً بند ہو چکا ہے۔ نتیجتاً ڈیزل کی عالمی قیمتوں میں 46 ڈالر فی بیرل سے زائد اضافہ ہوا اور پاکستان جیسے درآمد پر منحصر ملک کو اس کا براہ راست اثر پڑا۔ حکومت نے تین ہفتوں تک قیمتوں کو منجمد رکھ کر 129 ارب روپے کا بوجھ خود اٹھایا تھا مگر مالی دباؤ بڑھنے کے بعد اسے عالمی قیمتوں کا مکمل پاس تھرو کرنا پڑا۔ اس اضافے نے نہ صرف ٹرانسپورٹ کے اخراجات بلکہ پورے معاشی نظام کو متاثر کیا ہے کیونکہ تیل کی قیمتیں بڑھنے سے نقل و حمل مہنگا ہوگیا ہے اور کاروباری سرگرمیاں سست پڑ گئی ہیں۔

حکومت کے اس فیصلے نے عوام کو زندہ درگور کرنے کے مترادف کر دیا ہے کیونکہ پٹرول 458 روپے اور ڈیزل 520 روپے فی لیٹر ہونے سے نہ صرف روزمرہ سفر کرنا مشکل ہوگیا ہے بلکہ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے مالکان نے کرایوں میں اضافہ کر دیا ہے جس سے دودھ، سبزیاں، انڈے، گوشت اور دیگر بنیادی اشیاء کی ترسیل مہنگی ہوگئی ہے اور مارکیٹوں میں ان کی قیمتیں پہلے ہی انتہائی بلند سطح پر پہنچ چکی ہیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے لیے تو یہ صورتحال ناقابل برداشت ہے۔

خطرناک جراثیم سے بھرپور برتن دھونے والے سپونج

سپونج میں متعدد چھوٹے چھوٹے سوراخ اور گڑھے ہوتے ہیں جن میں ان جراثیم یا بیکٹریا کو پنپنے کو بہترین موقع ملتا ہے، اسے صاف کیسے رکھا جائے اور کتنے عرصے بعد بدلا جائے؟

.....شیر دل خان.....

سپونج ہر گھر کے کچن میں استعمال ہونے والی ایک عام سی چیز ہے جس کا استعمال ہم گندے برتنوں کو دھونے کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن آپ کے کچن کا گیلا سپونج ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جو بیکٹیریا کے پنپنے کے لیے بہترین ہے۔ مگر اس سپونج میں کتنے خطرناک جراثیم ہوتے ہیں اور آپ کو اس کے متبادل یعنی واشنگ برش کا استعمال کیوں کرنا چاہیے؟

بیکٹیریا یا جراثیم کی ہر قسم اپنے پنپنے کے ماحول سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔ کچھ زمین کی تہہ کے اندر، کچھ اُبلتے ہوئے ہائیڈروتھرمل وینٹس میں تو کچھ برف سے اٹے سرد ترین علاقوں میں بھی اپنا گھر بنانا بخوبی جانتے ہیں۔ اور اگر بیکٹیریا سے پوچھا جائے کہ وہ کہاں رہنا سب سے زیادہ پسند کریں گے؟ تو یقیناً اُن کا جواب ہوگا کہ آپ کے باورچی خانے میں موجود سپونج میں!

یعنی اس چیز میں جس سے ہم اپنے پانی کے گلاس، چمچے، پلیٹیں اور دیگچیاں وغیرہ دھوتے ہیں۔ سپونج بیکٹیریا یا جراثیم کے لیے ایک جنت کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سپونج گرم مرطوب، گیلے اور خوراک کے ذرات سے بھرے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ جراثیم یا بیکٹریا کی نشوونما کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتے ہیں۔ سنہ 2017 میں جرمنی کی فرٹ وانگن یونیورسٹی کے ایک مائیکرو بائیولوجسٹ مارکس ایگرٹ نے کچن کے استعمال شدہ سپنجوں میں بیکٹریا یا جراثیم سے متعلق اعداد و شمار شائع کیے تھے۔ انھوں نے ان سپنجز میں جراثیم کی 362 مختلف اقسام دریافت کی تھیں۔ اور ایک سپونج کی کچھ جگہوں پر بیکٹیریا کی کثافت 54 ارب جرثومے فی مربع سینٹی میٹر تک پائی گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ 'یہ بہت بڑی تعداد ہے۔ یہ اتنی ہی زیادہ ہے جتنی آپ کو انسانی فضلے یعنی پاخانے میں ملتی ہے۔'

سپونج میں متعدد چھوٹے چھوٹے سوراخ اور گڑھے ہوتے ہیں جن میں ان جراثیم یا بیکٹریا کو پنپنے کو بہترین موقع ملتا ہے۔ ڈیوک یونیورسٹی کے مصنوعی حیاتیات کے ماہر لچنگ یو اور اُن کی ٹیم نے سنہ 2022 میں ایک تحقیقی مطالعے کے لیے سپونج کے پیچیدہ ماحول کو ماڈل بنانے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کیا۔ انھوں نے اس تحقیق میں پایا کہ مختلف سائز کے سوراخ والے سپونج سب سے زیادہ جراثیم کی نشوونما کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی ٹیم نے ان سپونج میں ای کولی کی نشوونما کر کے ان نتائج کی جانچ کی۔ ایگرٹ کا کہنا ہے کہ 'انھیں پتہ چلا کہ باورچی خانے کے سپونج میں مختلف سائز کے سوراخ ہونا ایک ایسی چیز ہے جو واقعی بیکٹیریا کی افزائش کے لیے اہم ہے۔' وہ کہتے ہیں کہ 'یہ بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ آپ کے پاس ایسے بیکٹیریا ہوتے ہیں جو خود بڑھنا پسند کرتے ہیں، اور آپ کے پاس ایسے بیکٹیریا ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سپونج کے اندر آپ کے پاس اتنے مختلف ڈھانچے یا سوراخ ہوتے ہیں کہ ہر طرح کے بیکٹریا کو نشوونما کا موقع ملتا ہے۔'

سپونج یقینی طور پر بیکٹیریا کے لیے اچھے گھر ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم، یہ ضروری نہیں کہ یہ ہماری صحت کے لیے بھی خطرہ ہوں۔ بیکٹیریا ہر جگہ موجود ہیں۔ ہماری جلد پر، مٹی میں اور ہمارے اردگرد ہوا میں، مگر یہ سبھی نقصان دہ نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ بہت سے اہم کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اس لیے اہم سوال یہ ہے کہ کیا سپونج میں پائے جانے والے بیکٹیریا کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے؟

ایگرٹ کے سنہ 2017 کے مطالعے میں، انھوں نے عام بیکٹریا یا جراثیم کی اقسام کا ڈی این اے تجزیہ کیا۔ اگرچہ ہر جرثومے کی صحیح انواع کی شناخت کرنا ممکن نہیں تھا لیکن دس میں سے پانچ بیکٹیریا کا تعلق اُن جراثیم سے تھا جو انسانی صحت یا ان کے مدافعتی نظام کو متاثر کر سکتے تھے۔

ایسے میں سپونج کی صفائی کے لیے اسے مائیکرو ویو میں گرم کرنا یا گرم پانی سے یا صابن سے دھونا فائدہ مند نہیں تھا۔ یہ طریقہ کار اپنانے سے اگرچہ سپونج میں کچھ بیکٹیریا تو ختم ہوئے لیکن اس سے زیادہ مزاحمت کرنے والے چند بیکٹریا کی نشوونما کو مزید بڑھا دیا۔ ایگرٹ کا کہنا ہے کہ 'ہمارا مفروضہ یہ ہے کہ صفائی ستھرائی کے اقدامات ایک قسم کے انتخاب کے عمل کا باعث بن سکتے ہیں، جہاں بچ جانے والے چند جراثیم دوبارہ بڑی تعداد میں بڑھ سکتے ہیں۔' ایگرٹ کہتے ہیں کہ 'اگر آپ یہ عمل ایک، دو بار کرتے ہیں، تو اس سے ان بیکٹیریا کا انتخاب ہو سکتا ہے جو صفائی میں بہتر طریقے سے خود کو ڈھال لیتے ہیں۔' تاہم یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ ایگرٹ کے تجزیے یا تحقیق میں کوئی بھی ایسے بیکٹریا یا جراثیم نہیں ملے جو فوڈ پوائزننگ یا انسانی صحت خراب کرنے والے ہوں۔ درحقیقت فوڈ پوائزننگ کے سبب ہسپتال داخل ہونے والے مریضوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں سے 90 فیصد مریضوں میں صرف پانچ قسم کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جن میں سے تین بیکٹیریا ایسچریچیا کولی، سالمونیلا اور کیمپائلوبیکٹر نامی ہیں۔

شکر ہے یہ سپونج میں بہت ہی کم ہوتے یا بالکل نہیں ہوتے ہیں۔ ایگرٹ کا کہنا ہے کہ 'ہمیں سپونج میں صرف ممکنہ طور پر ایسے بیکٹیریا ملے ہیں جو کمزور مدافعتی نظام والے لوگوں، یا بوڑھوں یا بچوں کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔' ایگرٹ کہتے ہیں کہ 'عام طور پر ایک صحت مند شخص کے لیے، باورچی خانے کے سپونج کے اندر موجود بیکٹیریا نقصان دہ نہیں ہوتے ہیں۔'

تاہم اُن کا کہنا تھا کہ سپونج کے مقابلے میں برش میں مجموعی طور پر بہت کم بیکٹیریا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بیکٹریا آپ کے سپونج سے آپ کی پلیٹ، گلاس یا برتنوں پر بھی منتقل ہو سکتے ہیں۔ کوکلان کا کہنا ہے کہ 'سپونج پر موجود بیکٹیریا کی اکثریت بیماری کا باعث نہیں بنتی، وہ صرف اس میں بدبو پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں۔' وہ کہتے ہیں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اگر آپ کچے گوشت یا کچے چکن کے پانی یا خون کو صاف کرنے کے لیے سپونج کا استعمال کرتے ہیں تو اس میں کچھ مہلک بیکٹریا یا جراثیم موجود ہو سکتے ہیں، اور تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ پیتھوجینز یا مہلک جراثیم کچن کے سپونج سے الگ ہو کر کچن کی دیگر سطحوں پر لگ سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ کے سپونج میں بڑھنے والے بیکٹیریا عام طور پر نقصان دہ نہیں ہوتے ہیں، اگر خطرناک بیکٹیریا جیسے سالمونیلا اس پر آ جاتے ہیں، تو سپونج کی ساخت اسے اس پیتھوجین کے بڑھنے کے لیے ایک بہترین جگہ بناتی ہے۔

اس بات کے ثبوت موجود ہیں۔ کینکس روڈ کی تحقیق میں جب محققین نے سلمونیلا کو کچن کے سپونج میں متعارف کرایا تو وہ پروان چڑھے، لیکن جب انھوں نے اس بیکٹیریا کو برش پر ڈالا تو وہ مر گئے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ برش اکثر استعمال کے بعد زیادہ بہتر طریقے سے خشک ہو جاتے ہیں، جس سے سالمونیلا بیکٹیریا ہلاک ہو جاتے ہیں، جب کہ سپونج اندر سے گیلا رہ سکتا ہے۔ ممکنہ طور پر یہ بیکٹیریا آپ کے سپونج سے پلیٹوں اور برتنوں یا سطحوں پر بھی منتقل ہو سکتے ہیں۔

تو ہمیں اپنے باورچی خانے کے سپونج کو کتنی بار تبدیل کرنا چاہیے؟

کوکلان کا استدلال ہے کہ حفظان صحت کے نقطہ نظر سے، مثالی طور پر آپ کو اسے ہفتہ وار بنیاد پر تبدیل کرنا چاہیے، لیکن اس دورانیے کو بڑھانے کے لیے آپ اس کی صفائی کے کچھ طریقے بھی اپنا سکتے ہیں۔

سپونج کو صرف دو طریقوں سے صاف کیا جا سکتا ہے۔ آپ شام کے بعد ان کو ڈش واٹر میں رکھ سکتے ہیں یا پھر آپ ایک منٹ کے لیے انھیں مائیکرو ویو میں رکھ سکتے ہیں جب تک کہ اس میں سے آپ کو سٹیم نکلتی نظر نہ آئے۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سادہ طریقے سے نیچ سے برتن دھونے کے بجائے اس طریقے سے ڈش واٹر اور مائیکرو ویو میں برتنوں کی صفائی سے بیکٹیریا کی بڑی حد دھلائی ہو جاتی ہے۔ مگر ایگرٹ کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وقت کے ساتھ برتنوں کی دھلائی کم مؤثر رہ جاتی ہے کیونکہ اس سے ان پر زیادہ مزاحمت کرنے والے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ سپونج کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر اس سے صفائی کی جائے تو پھر اس سے زیادہ جراثیم مر جاتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ کچھ جراثیم بچ جائیں خاص طور پر

وہ جو حفاظتی تہہ بنا لیتے ہیں۔ اس طریقے سے برتن دھونے سے سلمونیلا نامی جراثیم کی مؤثر صفائی ہو سکتی ہے۔ اور ٹُکر یہ ہے کہ سپونج کو 'سنک' میں نہ رکھا جائے تاکہ یہ استعمال کے لیے پھر سے خشک ہو سکے اور ٹھیک سے کھانوں کے بچے ہوئے ذرات کی صفائی کر سکے۔ کچھ لوگ صفائی کے لیے اس سے بھی بالکل مختلف طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ایگرٹ کا کہنا کہ 'میں کچن والے سپونج سے کبھی صفائی نہیں پسند کروں گا۔' انھوں نے کہا کہ 'مجھے اس کی کوئی تک سمجھ نہیں آتی کہ اس طرح کی کسی چیز کو کچن جیسی جگہ پر استعمال کیا جائے۔' اُن کی تجویز کے مطابق اس مقصد کے لیے ایک برش بہت کارآمد ہے کیونکہ اس پر کم بیکٹیریا ہوتے ہیں اور یہ آسانی سے خشک بھی ہو جاتا ہے اور اس سے برتنوں کی صفائی بھی آسان ہوتی ہے۔'

☆.....☆